

# تصوف کیا ہے؟

مجموعہ مقالات

مولانا محمد منظور نعمانی

مولانا محمد اویس ندوی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

ادارۃ الشیخ الاسلامیہ

۱۹۰ - انارکلی ○ لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ  
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی اربنہ  
معدت البریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

## معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

### تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے  
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی  
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے  
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ [KitaboSunnat@gmail.com](mailto:KitaboSunnat@gmail.com)

🌐 [www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

# تصرف کیا ہے؟

مجموعہ مقالات

مولانا محمد شمس منظور نعمانی

مولانا محمد اویس ندوی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

تصرف کیا ہے؟

پہلی جلد

www.KitaboSunnat.com

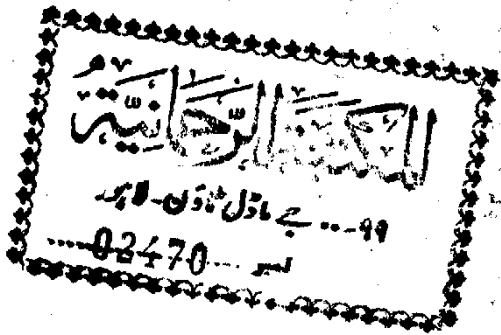
ادارۃ اسلامیات

۱۹۰ - انارکلی ○ لاہور

270

# نعمت

بار اول عکسی \_\_\_\_\_ سوال نمبر ۱۴۰۱، اگست ۱۹۸۱ء  
باہتمام \_\_\_\_\_ اشرف برادران سلیم الرحمن  
ناشر \_\_\_\_\_ ادارہ اسلامیات - لاہور  
طباعت \_\_\_\_\_ تجارت پریس لاہور -  
قیمت \_\_\_\_\_ /- ۶ روپے  
تعداد \_\_\_\_\_ ایک ہزار



## ملنے کے پتے

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور  
دارالاشاعت اردو بازار۔ کراچی نمبر ۱  
ادارہ المعارف۔ دارالعلوم، کراچی نمبر ۱۳  
مکتبہ دارالعلوم، دارالعلوم، کراچی نمبر ۱۳



# فہرست مضامین

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
۵		دیباچہ
۱۱	محمد منظور نعمانی	۱۔ تصوف پر ابتدائی غور اور تجزیہ
۲۹	"	۲۔ تصوف اور اسکے اعمال و اشغال کے متعلق میرے چند یقین۔
۵۱	"	۳۔ تصوف اور اسکے اعمال و اشغال کے متعلق بعض شبہات
۶۱	مولانا محمد اویس ندوی	۴۔ تصوف اور اسکے اعمال و اشغال کے متعلق شکوک و شبہات کا جواب
۸۰	"	۵۔ یقین اور اس کے ثمرات
۸۹	"	۶۔ تصوف اور شیعین
۱۱۱	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	۷۔ اہل تصوف اور دینی جدوجہد
۱۳۰	محمد منظور نعمانی	۸۔ تصوف اور احسان کے طالبوں کو چند ابتدائی مشورے

## عرض ناشر

یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۳۷۱ھ، ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد ختم ہو کر نایاب ہو گئی تھی۔ تقریباً بیس سال سے اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں تھا۔ مکتب خانۃ الفرقان میں بھی اتفاق سے اس کا کوئی نسخہ محفوظ نہیں رہا تھا۔ شائقین کے اصرار نے جب مجبور کیا تو ایک صاحب سے اس کا نسخہ حاصل کر کے کتابت کرائی گئی اور آفٹ سے اس کی طباعت کا انتظام کیا گیا۔ اتفاق سے کاغذ بھی اس وقت بچ گیا ہے۔ اس مجبوری سے قیمت بھی زیادہ رکھی پڑی جس کا خود ہیں احساس ہے۔ امید ہے کہ ناظرین اس میں ہیں معذور سمجھیں گے۔

ناظم مکتب خانۃ الفرقان، کچھری روڈ لکھنؤ

۵ اکتوبر ۱۹۷۳ء

نوٹ :- اب مولانا غلام رسول صاحب مدظلہ (جامعہ رشیدیہ سیالکوٹ) کی اجازت سے ادارۃ اسلامیات، لاہور کو پہلی بار پاکستان میں یہ کتاب طبع کرانے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔ آمین !

اشرف برادران، ادارۃ اسلامیات، لاہور



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## دیباچہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن دین الحق ﷺ کی زندگی کے جس طریقہ کی طرف دنیا کو دعوت دینے کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اس کا کامل ترین نمونہ خود آپ کی ذات مقدس تھی۔ اس لیے آپ کا طریقہ زندگی ہی وہ ”دین الحق“ اور وہ ”صراطِ مستقیم“ ہے جس پر چل کر بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا و رحمت کا مستحق بلکہ اُس کا محبوب بھی بن جاتا ہے۔ آپ کے اس طریقہ زندگی اور اسوۂ حسنہ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس میں مندرجہ ذیل تین شعبے دریافت ہوتے ہیں۔

۱۔ ایمان۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، وحی و رسالت، ملائکہ، قیامت، حشر نثر اور جنت و دوزخ، جیسی فیہی حقیقتوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خبریں دی ہیں اور جو کچھ بتلایا ہے، اُس سب کو حق ماننا اور دل سے اُس کی تصدیق کرنا۔ یہ دینِ حق کا سب سے اہم شعبہ ہے اور پورے دین کی اساس و بنیاد ہے اور یہی شعبہ ہمارے علم عقائد کا موضوع ہے۔

۲۔ اعمال صالحہ: یہاں اس سے ہماری مراد دین کا وہ تمام تر

عمل ہے جو جوہر یعنی ظاہری اعضاء سے تعلق رکھتا ہے، جس میں

اسلامی عبادات اور دعوت و جہاد اور معاملات و آداب معاشرت وغیرہ داخل ہیں۔ یہ شعبہ گویا دین کا پورا قالب ہے اور یہی اسلام کا علی نظام ہے اور ہمارے علم فقہ کا خاص تعلق اسی شعبہ سے ہے۔

۳۔ روحانی و قلبی صفات و کیفیات اور تزکیۃ اخلاق :- جن لوگوں کی کتاب و سنت پر کچھ نظر ہے وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ حضرت رسول اللہ نے جس طرح ایمانیات و اعتقادات اور عبادات اور آداب معاشرت و معاملات کے ابواب میں اپنی تعلیم و ہدایت اور عملی نمونہ سے امت کی رہنمائی فرمائی ہے اسی طرح آپ نے اللہ تعالیٰ کی محبت و خشیت، یقین و توکل، احسان و اخلاص جیسی روحانی و قلبی صفات و کیفیات اور تزکیہ اخلاق کے متعلق بھی اہم ہدایات دی ہیں اور ان کا نہایت اعلیٰ اور مثالی نمونہ امت کے لیے چھوڑا ہے۔ الغرض ایمان اور اعمال صالحہ کی طرح یہ بھی دین کا ایک مستقل اور اہم شعبہ ہے اور یہی تصوف و سلوک کا خاص موضوع ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ذات تو ان تینوں شعبوں کی یکساں طور پر جامع تھی اور کسی درجہ میں ایسی ہی جامعیت اکابر صحابہؓ کو بھی حاصل تھی۔ لیکن بعد کے قرون میں زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے اکثر وارثین و ناسبین اگرچہ ذاتی طور پر کم و بیش ان تینوں شعبوں کے حامل اور جامع ہوتے تھے لیکن اپنی اپنی صلاحیت و استعداد اور ذوق یا ماحول کے مطابق انہوں نے کسی ایک شعبہ کی خدمت سے اپنا خاص تعلق رکھا اور بے شک بعد کے ان قرون میں دین کا پھیلاؤ جس درجہ بڑھ گیا تھا اور جو حالات پیدا ہو گئے تھے ان میں ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا۔ اس



صودت اور اس تقسیم عمل نے خواص اُمت میں ائمہ عقائد، فقہاء اور صوفیاء کے الگ الگ طبقے پیدا کئے۔

پس جس طرح ائمہ عقائد اور فقہاء نے خصوصیت کے ساتھ دین کے پہلے دو شعبوں کی حفاظت اور ترویج و تفصیل کی اسی طرح حضرات صوفیاء نے دین کے تیسرے اہم شعبہ کی خدمت و حفاظت اور اس باب میں اُنحضرت کی نمائندگی و نیابت کی۔ اور اس لیے امت پر اُن کا بھی بہت بڑا احسان ہے اور دین کے اس تکمیلی شعبہ میں امت ان کی خدمات کی ممنون اور محتاج ہے۔

پس سلوک و تصوف کی اصل غرض و غایت اور صوفیاء کرام کی مساعی کا اصل نصب العین دراصل دین کا یہی تیسرا شعبہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت و خشیت اور اخلاص و احسان اور زہد و توکل جیسی روحانی و قلبی صفات و کیفیات کی تحصیل اور اخلاق کا تزکیہ۔ لیکن چونکہ یہ چیزیں صرف کتابی مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتیں بلکہ ان کا صحیح اور اک بھی نہیں ہوتا اور اس دولت کے کسی وارث اور حامل کی صحبت و خدمت میں رہ کر مشاہدہ آثار ہی کی راہ سے ان کی کچھ معرفت ہوتی ہے اور پھر اُن کے حصول کے متعلق بھی عام سنت اللہ چونکہ یہی ہے کہ اس کے حاملین کی صحبت و رفاقت اور تربیت ہی اس کا عام ذریعہ ہے اسلئے ایسے لوگ اس شعبہ سے اکثر محروم اور اُس کی معرفت سے بھی قاصر رہتے ہیں جو کسی ایسے بندہ کی صحبت و رفاقت کی توفیق نہ ملی ہو جو اس دولت کا حامل ہو۔

ہمارے اس زمانہ میں جو بہت سی نئی چیزیں اور نئے حالات پیدا ہوتے ہیں ان کی تشریح و اشاعت کی وسعت اور کتابوں کی

کثرت نے بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ پیدا کر دیئے ہیں جو دین کو صرف کتابوں اور رسالوں کے صفات سے حاصل کرتے ہیں (اور یہ چیز فی نفسہ کچھ بڑی نہیں ہے بلکہ اس لحاظ سے اچھی ہی ہے کہ اس طرح دینی افادہ و استفادہ کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے) لیکن چونکہ ان کو دین کے کسی ایسے بالا تر نمونے کے دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوتا جو خصوصیت سے اس تیسرے شعبہ کا بھی حامل ہو اور جسکو دیکھ کر یہ اپنے علم و عمل کو ناقص و نارسیدہ اور اپنی دینی معرفت کو ناقص سمجھ سکیں۔ اس لیے بسا اوقات یہ حضرات اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے اور لٹریچر کی راہ سے جو ہم نے جان بوجھ لیا ہے۔ بس یہی ”کل دین“ ہے اور چونکہ آج کل کا عام پسند دینی لٹریچر زیادہ تر ایسے ہی اہل علم و اصحاب قلم کا تیار کیا ہوا ہے جو خود اس مرض میں مبتلا ہیں، اس لیے وہ اپنے ناظرین کو اس بیماری سے نکلانے کے بجائے ان کے مرض کو اور زیادہ راسخ اور سنگین کر دیتا ہے اور اس سے زیادہ رنج و افسوس کی بات یہ ہے کہ اس محرومی میں ہمارے قدیم دینی مدارس کے پڑھے ہوئے وہ بہت سے فضلاء بھی اس کتابی طبقے کے شریک حال ہیں جو کسی وجہ سے اس شعبہ سے نا آشنا ہونے کے باوجود اسی زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس لیے دین کے اس تکمیلی شعبہ کی طلب اور تحصیل کا کوئی داعیہ ان کے دلوں میں پیدا نہیں ہوتا۔

اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل تعجب اور موجب حیرت دوقیہ بعض ان حضرات کا ہے جو حضرت محمد و الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، امیر المؤمنین سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کو اپنے اپنے زمانوں کا مجدد اور دین و سنت

کو زندہ کرنے والا مانتے ہیں اور اس کے ساتھ تقوٰف کو ضلالِ مبین بھی کہتے ہیں۔ حالانکہ جس کسی نے حضرت مجددؑ کے مکتوبات، شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی عبققات اور منصب امامت اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے مجموعہ ملفوظات "صراطِ مستقیم" کا مطالعہ کیا ہو وہ اس حقیقت سے مزور واقع ہوگا کہ یہ حضرات سلوک و تقوٰف کے صرف قائل اور حامل ہی نہیں بلکہ دین کے اس شعبہ کے خاص داعی اور علمبردار اور اصحابِ سلاسلِ ائمہ ہیں اور اپنی تعلیم و تربیت اور اپنے تعامل میں ان حضرات نے تقوٰف کو خاص اور غیر معمولی اہمیت دی ہے اور جو لوگ اس سے بے بہرہ ہوں ان کو "دین کے منفر سے بے نصیب" تک لکھا ہے پس ایک طرف ان کو مجدد (یعنی اپنے اپنے وقت میں نبوت و رسالت کی بدرجہ اختصاص نیابت کرنے والا) ماننا اور دوسری طرف زندگی کے ان کے سب سے نمایاں پہلو اور ان کے عمر بھر کے طرزِ عمل کو "ضلالِ مبین" قرار دینا اور جو لوگ اس پودھوں صدی میں گذشتہ صدیوں کے ان ائمہ اور مجددین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوں ان کے طریقہ پر اصلاح و تزکیہ نفس کی کوشش کو صحیح سمجھتے ہوں، ان پر خانقاہیت اور "پیری مریہی" کی پھبتیاں کسنا! اسکے سوا کیا عرض کیا جائے کہ دینی ذمہ داریوں کے عدم احساس کے علاوہ علمی سنجیدگی کے مقام سے بھی گری ہوئی بات ہے۔

یہ چھوٹی سی کتاب جو دراصل چند مقالات کا مجموعہ ہے، اسکی اشاعت سے ہماری خاص غرض اور امید یہی ہے کہ دین کے اس تکمیلی شعبہ کی جو واقعی نوعیت اور افادیت ہے اور دین میں اس کا جو حقیقی مقام ہے، اللہ کے باتوفیق بندے سے ملے۔ ملحق ہو کہ اُس خیر کثیر اور اُس دولتِ عظیمی کو حاصل کریں جو اس راستے سے

حاصل کی جاسکتی ہے اور لاکھوں بندگانِ خدا نے حاصل کی ہے اور اس کے بارے میں آج کل کے اکثر ذہنوں میں ہوشو کوک و شبہات اور الجھنیں حقیقت ناشناسی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، وہ صاف ہوں۔

اس میں شروع کے تین مقالے خود اس عاجز راقم سلوہ کے ہیں۔ اسکے بعد تین ہی مقالے ہمارے محترم دوست مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرانی کے ہیں۔ اس کے بعد ایک مقالہ اہل تصوف اور دینی جدوجہد رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے۔ آخری آٹھواں مقالہ اسی عاجز کا ہے۔

کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے اور کچھ طویل اور ضخیم بھی نہیں ہے۔ بس خود پڑھیے اور لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے براہِ راست واقفیت حاصل کیجئے اور اگر باتیں صحیح اور اچھی معلوم ہوں تو ان سے فائدہ اٹھاتے اور لکھنے والوں کے لیے دُعا کے خیر کیجئے۔

محمد منظور نعمانی رَحِمَهُ اللهُ عَلَيهِ

ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ

طبع ثانی کے لیے نظر ثانی کی تاریخ ۱۵ شعبان ۱۳۹۳ھ



# تصوف پر ابتدائی غور اور تجربہ

(از محمد منظور نعمانی)

۱۳۶۱ھ کے اواخر یا ۱۳۶۲ھ کے اوائل میں بعض ایسے حالات سے میں دوچار ہوا کہ چند دن کسی ایسی جگہ رہنے کی میں نے ضرورت محسوس کی، جہاں دل و دماغ افکار و مکروہات سے محفوظ رہیں اور قلب کو کچھ سکون و اطمینان حاصل ہو۔ اس مقصد کے لیے میری نظر انتخاب اس زمانے کے ایک صاحب ارشاد بزرگ کی خانقاہ پر پڑی جو آبادی اور آبادیوں کے شور و شغب سے الگ تھلگ جنگل میں واقع ہے۔ اور نظر بھی سرسبز و شاداب ہے۔ بہر حال میں وہاں پہنچ گیا۔

غالباً پہلا ہی دن تھا، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وہ محترم بزرگ خانقاہ کے محن میں ایک پلنگ پر تشریف فرما تھا، ازراہ شفقت و کرم مجھے بھی اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا تھا۔ یاد آتا ہے کوئی تیسرا شخص اُس وقت وہاں نہیں تھا۔ قریب ہی خانقاہ کی سردری میں چند ڈاکر "لفی اثبات" کا اور بعض اُن میں سے "اسم ذات" کا ذکر کر رہے تھے۔ سب اچھے خاصے جہر کے ساتھ ذکر کرتے تھے اور مشائخ سلوک کے

تجویز کئے ہوئے خاص طریقوں سے قلب پر ضرب لگاتے تھے۔ اللہ کے ذکر میں جہر و ضرب کا یہ طریقہ اُس وقت میرے لیے صرف نامانوس ہی نہ تھا بلکہ کسی درجہ میں گویا ناقابل برداشت تھا، چنانچہ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا :-

”حضرت! ساری عمر دین کے بارے میں جو کچھ پڑھا ہے اور دو کتابوں میں جو دیکھا ہے اُس سے یہ سمجھا ہوا ہے کہ اصل دین صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے اور جس کی تعلیم آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دی اور پھر صحابہ کرامؓ سے بعد والوں نے سیکھا اور صحیح نقل و روایت کے ذریعے جو اُن سے ہم تک پہنچا۔

اور یہ حضرات ذاکرین جس طرح جہری اور ضری ذکر کر رہے ہیں جہاں تک اپنا علم ہے، نہ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ کرامؓ کو یہ تعلم فرمایا تھا۔ نہ صحابہ کرامؓ نے تابعین سے اس طریقے پر ذکر کرایا اور نہ تابعین نے اپنے بعد والوں کو یہی یہ طریقہ بتلایا تھا۔ اس لیے ذکر کے اس طریقے کے بارے میں مجھے خلیجان ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اگر میرا یہ خلیجان کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہے تو اسکی تصحیح ہو جائے“

اُن بزرگ نے توقع کے خلاف میرے اس سوال کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے ایک عجیب انداز میں فرمایا :-

”مولوی صاحب! یہ بے چارے جو یہاں میرے پاس آتے ہیں، یہ کسی اور کام کے نہیں ہوتے۔ بس اسی کام کے ہوتے ہیں اور اسی کے واسطے آتے ہیں، اس لیے میں اُن کو یہ ہی بتلا دیتا ہوں، آپ جو کام کرتے ہیں یعنی تقریر و تحریر سے دین کی خدمت، یہ بہت بڑا کام ہے۔ آپ تو یہی کرتے رہیں اور اس چکر میں نہ پڑیں“

ظاہر ہے کہ یہ میرے سوال کا جواب نہ تھا۔ لیکن اُن بزرگ نے میری بات کے جواب میں اتنا ہی فرمایا اور مجھے کچھ اور عرض کرنے اور اپنے اصل سوال کی طرف مگر توجہ دلانے کی مہلت دیئے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کے بعض اجتماعی مسائل اور اُن کے مستقبل پر گفتگو کا ایک نیا سلسلہ شروع فرما دیا جو میرے لیے بھی دلچسپ تھا۔ اُن کا یہ رویہ دیکھ کر پھر سے اپنے سوال کو اٹھانا میں نے بھی مناسب نہ سمجھا اور عشاء کے قریب یہ مجلس ختم ہو گئی۔

اگلے دن مغرب کے بعد پھر یہی ہوا کہ ذاکرین نے اسی دھن کے ساتھ اپنا اپنا ذکر شروع کیا۔ مجھ سے پھر نہ رہا گیا اور میں نے کل کا اپنا سوال پھر یاد دلایا۔ لیکن آج بھی اُن بزرگ نے وہی کل والا رویہ اختیار فرمایا کہ میری بات کو بالکل نظر انداز فرما کر ہندوستانی مسلمانوں کی غالباً مافی اور حال کی مختلف تحریکوں پر گفتگو کا ایک لمبا سلسلہ شروع فرما دیا اور میرا سوال پھر رہ گیا۔

اُن بزرگ کے اس ردیہ سے الحمد للہ میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوا کہ چونکہ میرے سوال کا کوئی جواب ان کے پاس ہے نہیں، اس لیے یہ اس سے پہلوتھی کہ رہے ہیں، بلکہ مجھے یہ خیال ہوا کہ غالباً میرے سوال کو ایک اہل اور طالبِ صادق کا سوال نہیں سمجھا گیا ہے۔ بلکہ ایک مبتلا نے زعم و کبر کا اعتراض سمجھ کر اس کو اس طرح نظر انداز فرمایا جا رہا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اُس وقت اس سوال سے اپنی تشفی (جہاں تک اب یاد ہے) مقصود بھی نہ تھی، بلکہ نیت کچھ اور ہی تھی۔

خانقاہ کے جس حجرے میں میرے سونے کا انتظام تھا، نمازِ عشاء وغیرہ سے فارغ ہو کر میں اُس میں جا کر لیٹ گیا اور تصوت کے اس قسم کے اعمال و اشغال پر بطور خود ہی غور کرنے لگا۔ اس غور و فکر میں خود ہی سائل تھا اور خود ہی مجیب۔ یاد آتا ہے کہ اس ذہنی بحثِ مباحثہ میں دیر تک نیند نہیں آئی۔ میں چاہتا تھا کہ ذہن اس مسئلہ میں بالکل یکسو ہو جائے، اگر میرے سوچنے میں کوئی غلطی ہو رہی

لے صوفیوں کو اُنکے ایک بڑے استاد (حافظ شیرازی) کا مشورہ بھی ہے۔

یاد می ملوئید اسرارِ عشق و مستی  
بلکہ رید تا بمیر در رنج خود پرستی



ہے تو اس کی تصحیح ہو جائے اور اگر نہیں ٹھیک طور پر سمجھ رہا ہوں تو پھر اس بارے میں مجھے ایسا یقین و اطمینان حاصل ہو جائے کہ میں پوری قوت سے ان چیزوں کا رد و انکار کروں اور ان باتوں کے غلط باطل ہونے پر ایک پختہ حق پرست کی طرح اصرار کروں۔

اسی غور و خوض میں دیر کے بعد میرا ذہن ایک دفعہ اس طرف منتقل ہوا کہ تقویٰ کے ان خاص اعمال و اشغال کو (مثلاً ذکر و مراقبہ کے ان مخصوص طریقوں کو جو مشائخ کے تجویز کئے ہوئے ہیں اور اپنی قیود و اوضاع کے ساتھ سنت سے ثابت نہیں ہیں) میرا بدعت اور نادرست سمجھنا اگر صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسماعیل شہید اور ان سے بھی پہلے ان جیسے بہت سے حضرات کو مجدد یا مصلح نہیں، بلکہ بدعات کا حامی اور بدعات کا رواج دینے والا ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ان حضرات نے صرف اتنا ہی نہیں کہ کسی مصلحت یا وقت کے تقاضے سے ان چیزوں کے بارے میں تسامح اور تساہل ہی برتا ہو، بلکہ ان کی تعلیم سے ان کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور ساری عمر اپنے پاس آنے والے طالبین کو انہوں نے ان ہی طریقوں سے ذکر و شغل کرا کے ان کا سلوک طے کرایا ہے، بلکہ ان حضرات میں سے اکثر کی زندگی میں جس قدر یہ پہلو نمایاں ہے ان کی کتابوں کے پڑھنے والے اور حالات کے جاننے والے جانتے ہیں کہ غالباً کوئی دوسرا پہلو اتنا نمایاں نہیں ہے۔

ذہن کے اس طرف منتقل ہونے کے بعد دل نے یہ فیصلہ تو جلد ہی ہی کر لیا کہ

مجھ جیسے کم فہم اور ناقص العلم کا کسی مسئلہ کے سمجھنے میں غلطی کرنا نہ زیادہ ممکن اور زیادہ قرین قیاس ہے، بہ نسبت اس کے کہ امام ربانی مجددِ ثالثی اور حضرت شاہِ دلی اللہ شاہ اسمعیل شہیدؒ جیسے اکابر علم و دین کی طرف غلطی کو منسوب کیا جائے۔ اور وہ بھی ایک ایسے فن سے متعلق مسئلہ میں جس کے ساتھ ہمارا تعلق تو صرف نظری ہے اور ان حضرات کا عمر بھرا سکے ساتھ گہرا علمی تعلق رہا ہے۔

دل نے اپنے خلاف یہ فیصلہ جلدی اور آسانی سے اس لیے کر لیا کہ ان حضرات کی تسانیف کے مطالعہ اور ان کے شخصی حالات اور اصلاحی و تجدیدی خدمات سے کچھ واقفیت کی وجہ سے ان کے دسوخ فی العلم، تفرقہ فی الدین اور عند اللہ مقبولیت کا میں پہلے ہی سے پوری طرح قائل تھا اور میرا دل کسی طرح یہ قبول نہیں کر سکتا کہ یہ سب حضرات (اپنے اپنے زمانہ میں امرا دین کے عارف اور ائمت کے مجدد ہونے کے باوجود) چند بدعتوں کو قربِ خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خود بھی ساری عمر ان میں مبتلا رہے اور اللہ کے ہزاروں بندوں کو بھی ان میں مبتلا کرتے رہے۔ بے شک مجددِ نبوی کی طرح معصوم اور صاحبِ وحی تو نہیں ہوتا۔ لیکن وہ بدعات کا داعی اور مروج بھی نہیں ہو سکتا۔ خاص کر دین کے جس شعبہ میں اس کو دوسرے سب شعبوں سے زیادہ انہماک ہو اور وہ اس کا خاص داعی ہو اور اسی کے ذریعہ اصلاح و تجدید کا کام کر رہا ہو۔ اس میں اگر وہ بدعت وغیرہ میں اتیان نہ کر سکے گا تو یقیناً وہ اصلاح سے زیادہ فساد کا اور ہدایت سے زیادہ ضلالت کا باعث ہو گا۔

بہر حال یہ چند خیالی ٹکنتے تھے جن پر پہنچ کر میرے ذہن کی الجھن کچھ کم ہوئی اور میں نے مان لیا کہ غالباً مجھ سے ہی اس مسئلہ کے سمجھنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے اب مجھے اپنی غلطی ہی کو پکڑنے اور پالینے کی کوشش کرنا چاہیے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر میں نے اس غور و فکر کا سلسلہ اُس وقت ختم کر کے سو جانے کا ارادہ کر لیا اور سو گیا۔

جن بزرگ کی خانقاہ کا یہ قہقہہ ہے اُن کا معمول ہے کہ روزانہ نماز فجر کے بعد چند میل ٹہلتے ہیں۔ اُس دن یہ عاجز بھی ساتھ ہو لیا اور رات کے اپنے ذہنی بحث و مباحثہ اور اُس کے نتیجہ کا ذکر کیا اور عرض کیا :-

”میرے دل و دماغ نے یہ تو مان لیا ہے کہ تصوف کے ان اعمال و اشغال کے بارے میں جو اب تک میں نے سمجھا ہے غالباً وہ صحیح نہیں ہے اور اس میں کوئی غلط فہمی مجھے ہو رہی ہے، لیکن ابھی تک میں اُس غلطی کو پکڑ نہیں سکا ہوں، چونکہ طبیعت طالب علمانہ پائی ہے اس لیے چاہتا ہوں کہ یہ گرہ بھی کھل جائے اور جو غلطی باقی ہے وہ بھی نکل جائے۔“

موصوف میری یہ بات سن کر مسکرائے اور فرمایا :  
 ”مولوی صاحب! آپ کو یہی تو شبہ ہے کہ یہ چیزیں بدعت ہیں؟ یہ بتلائیے کہ بدعت کی تعریف کیا ہے؟“  
 میں نے عرض کیا :-

”بدعت کی تعریف تو علماء کرام نے کئی طرح سے کی ہے، لیکن جو زیادہ منقح اور محقق معلوم ہوتی ہے وہ یہی سیدھی سی تعریف ہے کہ دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ جس کے لیے شریعت میں کوئی دلیل نہ ہو۔“

نہ پایا :-

”ہاں ٹھیک ہے، لیکن یہ بتلائیے کہ اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مامور بہ ہو اور اللہ و رسول نے اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو، لیکن کسی وقت زمانہ کے حالات بدل جانے سے وہ اُس طریقے سے حاصل نہ کی جاسکتی ہو، جس طریقے سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں حاصل ہو جایا کرتی تھی، بلکہ اُس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کیا اس نئے طریقے کے استعمال کو بھی آپ دین میں اضافہ“ اور ”بدعت“ کہیں گے؟ (پھر اپنے مقصد کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے فرمایا) مثلاً دین سیکھنا سکھانا ضروری ہے۔ اور دین میں اس کا نہایت ہی تاکید حکم ہے اور آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانہ میں اس کے لیے صرف صحبت کافی ہو جاتی تھی، تعلیم کے لیے کوئی مستقل انتظام نہیں تھا۔ نہ مدرسے تھے، نہ کتا بن تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے ہو گئے کہ صحبت اس

مقصد کے لیے کافی نہیں رہی، بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑ گئی، تو اللہ تعالیٰ کے بندوں نے کتب میں لکھیں اور مدرسے قائم کئے اور اس کے بعد سے دین کی تعلیم و تعلم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا اور اب تک اسی سے قائم ہے۔ تو کیا تعلیم و تعلم کے طریقے میں اس تبدیلی کو بھی ”دین میں اضافہ“ اور بدعت کہا جائے گا؟

یہیں نے عرض کیا :-

”نہیں!“ ”دین میں اضافہ“ جب ہوتا ہے، جبکہ مقصود اور امر شرعی بنا کر کیا جائے۔ لیکن اگر کسی دینی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے قدیمی طریقے کے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے کوئی نیا جائز طریقہ اختیار کر لیا جائے تو اس کو ”دین میں اضافہ“ نہیں کہا جائے گا اور نہ وہ بدعت ہوگا۔“

فرمایا :-

”بس سلوک کے جن اعمال و اشغال پر آپ کو بدعت ہونے کا شبہ ہے، ان سب کی نوعیت بھی یہی ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی مقصد سمجھ کر نہیں کی جاتی، بلکہ یہ سب نفس کے نزدیک اور تہلیہ سے لیے کر لیا جاتا ہے، جو دین میں مقصود اور مامور ہے۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ہر وقت اُس کا اور اُس کی رضا کا دھیان، فکر رہنا اور اس کی طرف سے

کسی وقت بھی غافل نہ ہونا، یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں اور قرآن و حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر ایمان اور اسلام کامل ہی نہیں ہوتا۔<sup>۱۵</sup>

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دین کے لیے تعلیم و تربیت کی طرح یہ ایمانی کیفیتیں بھی آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہو جاتی تھیں اور حضور کے فیضانِ صحبت سے صحابہ کرام کی صحبتوں میں بھی یہ تاثیر تھی۔ لیکن بعد میں ماحول کے زیادہ بگڑنے اور استعماروں کے ناقص ہو جانے کی وجہ سے اس مقصد کے لیے کاملین کی صحبت بھی کافی نہیں رہی، تو دین کے اس شعبہ کے اماموں نے ان کیفیات کے حاصل کرنے کے لیے صحبت کے ساتھ ذکر و فکر کی کثرت کا اعناذہ کیا اور تجربہ سے یہ تجویز صحیح ثابت ہوئی۔

اسی طرح بعض مشائخ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے احوال کا تجربہ کر کے ان کے نفس کو توڑنے اور شہوات کو مغلوب کرنے اور طبیعت میں لینت پیدا کرنے کے لیے ان کے واسطے خاص خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کئے۔ اسی طرح ذکر کی تاثیر بڑھانے

۱۵ کتاب و سنت کے جن نصوص سے یہ بات معلوم ہوتی ہے ان میں سے چند آئندہ اوراق میں ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے۔ ۱۳

کے لیے اور طبیعت میں رقت اور یکسوئی پیدا کرنے کے لیے ضرب کا طریقہ نکالا گیا ہے، تو ان میں سے کسی چیز کو بھی مقصود اور مامور بہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ سب کچھ علاج اور تدبیر کے طور پر کیا جاتا ہے اور اسی لیے مقصد حاصل ہو جانے کے بعد یہ سب چیزیں چھڑا دی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ طریق اپنے اپنے زمانے کے حالات اور اپنے اپنے تجربوں کے مطابق ان چیزوں میں رد و بدل اور کمی بیشی بھی کرتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے رہتے ہیں، بلکہ ایک ہی شیخ کبھی کبھی مختلف طالبوں کے لیے ان کے خاص حالات اور ان کی استعداد کے مطابق الگ الگ اعمال و اشغال تجویز کرتا ہے اور بعضے ایسی اعلیٰ استعداد والے بھی ہوتے ہیں جنہیں اس طرح کا کوئی ذکر شغل کرانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ ان کو یوں ہی نصیب فرمادیتا ہے۔ اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان سب چیزوں کو صرف علاج اور تدبیر کے طور پر ضرورتاً کیا کرایا جاتا ہے۔“

ان بزرگ کی اس تقریر اور توضیح سے میرا وہ ذہنی خلجان تو دور ہو گیا لیکن ایک نئی پیاس یہ پیدا ہو گئی کہ یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کو خود آزما کے دیکھا جائے اور اپنے ذاتی تجربے سے قلبی اطمینان اور مزید یقین حاصل

کیا جائے۔ لیکن میرے حالات اور مشاغل میں اس کی گنجائش نہیں تھی کہ اس تجربے کے لیے میں کوئی بڑا اور مستقل وقت دے سکوں۔ اس لیے میں نے بے تکلف اور صفائی سے عرض کیا :-

رد اگر یہ ذکرِ شغل ان مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں تو پھر تو میں بھی اس کا محتاج ہوں، لیکن میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا، کیونکہ دین کے جن دوسرے کاموں سے کچھ تعلق کر رہا ہے۔ اُن کو بھی میں پھوٹا نہیں چاہتا۔“

سہ ماہیا :-

رد مولوی صاحب! تصوف دین کے کام چھڑانے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے تو دین کے کاموں میں قوت آتی ہے اور جان پڑتی ہے، لیکن کیا عرض کیا جائے اللہ کی مشیت ہے، جن کو اللہ نے دین کے کاموں کے قابل بنایا ہے وہ اب ادھر توجہ ہی نہیں کرتے، حالانکہ اگر تھوڑی سی توجہ بھی وہ ادھر دے دیں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے، باوا صاحبؒ نے اور بعد میں حضرت مجدد صاحبؒ، حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت سید صاحبؒ نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمتیں انجام دیں اور جو کچھ کر دکھایا (جن کا سواں اور



ہزاروں حصّہ بھی ہماری بڑی بڑی انجمنیں اور جماعتیں نہیں کر سکتی ہیں، اُس میں ان کے اخلاص اور قلب کی اُس طاقت کو خاص دخل تھا جو تقوٰت کے راستہ سے پیدا کی گئی تھی۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس طرف صرف وہی بے چارے آتے ہیں جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہی ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں استعدادیں مختلف رکھی ہیں۔ ناقص استعداد کا آدمی اعلیٰ استعداد والوں کا کام نہیں کر سکتا۔“

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا :-

”خدا معلوم لوگ تقوٰت کو کیا سمجھتے ہیں، تقوٰت تو بس صرف اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہو سکتا ہے، وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا، تو دراصل تقوٰت ضروری نہیں ہے، بلکہ عشق اور اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اگر کسی کو اس کے حاصل کرنے کا اس سے بھی آسان اور مختصر کوئی اور راستہ معلوم ہو جائے تو مبارک ہے، وہ اسی راستے سے حاصل کر لے اور ہم کو بھی بتلا دے، ہم تو اسی راستے کو جانتے ہیں جس کا اللہ کے ہزاروں

صادق بندوں نے سینکڑوں برس سے تجربہ کیا ہے، جن میں  
سینکڑوں وہ تھے جو دین کے اس شعبہ کے مجتہد بھی تھے اور  
صاحبِ الہام بھی تھے۔“

میں نے عرض کیا :-

رد جو شخص پہلے سے کسی دینی کام میں لگا ہوا ہو اور وہ یہ  
محسوس کرتا ہو کہ اُسے عشق اور اخلاص نصیب نہیں ہے تو  
کیا وہ کسی مدت تک اُس کام کو چھوڑ کے پہلے اس کی تحصیل  
کمرے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اُس کو بھی  
کہتا رہے اور اُس کے ساتھ اس کو بھی حاصل کرنے کی  
کوشش کرے؟“

فرمایا :-

» ہاں ! ہو سکتا ہے، البتہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں  
کچھ مدت کے لیے یکسوئی کے ساتھ اسی طرف مشغول ہونے کی  
ضرورت ہوتی ہے۔“

میں نے عرض کیا :-

» کیا اس کے لیے بیعت ہونا بھی ضروری ہے؟“

فرمایا :-

» نہیں ! بالکل نہیں ! ہاں طلب اور اعتماد کے ساتھ محبت  
اور صحبت ضروری ہے، بیعت تو صرف تعلق اور اعتماد کے اظہار

کے لیے ہے، ورنہ اصل مقصد میں بیعت کو کوئی خاص  
 دخل نہیں ہے۔“  
 میں نے عرض کیا :-  
 ” پھر مجھ کو بھی کچھ فرمادیں “  
 فرمایا :-

” مولوی صاحب! حدیث میں ہے ”المستشار موثقت“  
 (جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہے، اُس کو پوری دیانتداری  
 سے مشورہ دینا چاہیے) میں آپ کے لیے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ  
 آپ اس مقصد کے لیے فلاں صاحب یا فلاں صاحب کی  
 طرف رجوع کریں، ان حضرات پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے  
 اور آپ جیسے علم والوں کے لیے میں ان ہی حضرات کو اہل  
 سمجھتا ہوں۔“

میں نے عرض کیا :-  
 ” ان دونوں بزرگوں کی عظمت پہلے سے بھی کچھ دل میں تھی اور  
 اب حضرت کے اس ارشاد سے اور زیادہ ہو گئی ہے، لیکن  
 چونکہ مجھ میں یہ طلب نہیں پیدا ہوئی ہے اس لیے میں تو اس  
 راستے میں حضرت ہی سے راہنمائی حاصل کرنا اپنے لیے بہتر  
 سمجھتا ہوں۔“

موصوف نے اپنی محبت و شفقت کے پورے اظہار کے ساتھ ایک یادو

دفعہ پھر انہی دونوں بزرگوں کا حوالہ دیا، لیکن جب میں نے ادب کے ساتھ اپنی ہی رائے پر اصرار کیا تو قبول فرمایا اور میری معروفیتوں کا پورا لحاظ فرماتے ہوئے ذکر وغیرہ کا بہت مختصر سا پرگرام تجویز فرما دیا۔ اور میں نے کرنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد میں غالباً چار پانچ دن وہاں اور مقیم رہا۔ جب اجازت لے کر رخصت ہونے لگا تو خاص اہتمام سے فرمایا :-

”حضرت دہلوی (یعنی حضرت مولانا محمد ایازؒ) کی خدمت میں

آپ ضرور جایا کریں اور کچھ قیام کیا کریں“

اس موقع پر مولانا موصوفؒ کے متعلق بہت بلند چند کلمات بھی ارشاد فرمائے اور یہ حقیقت ہے کہ ان بلند کلمات ہی نے مجھے اس مشورے کی تعمیل پر آمادہ کیا اور جیسا کہ مولانا مرحومؒ کے ملفوظات کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں، اس کے بعد ہی میں نے مولانا موصوفؒ کی شخصیت کو کچھ جانا اور کچھ عرصے کے بعد میں یہ بھی سمجھ سکا کہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا اتنے اہتمام سے مجھے کیوں مشورہ دیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ خانقاہیت اور خانقاہی مشاغل اور اہل خانقاہ سے مجھے جو بعد تھا اُس میں اچھا خاصہ داخل میرے اس احساس کو بھی تھا کہ ان حلقوں میں دین کا فکر اور اُس کی خدمت کا جوش میں کم پاتا تھا، حالانکہ میں اُسکو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خاص میراث سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ

ان بزرگ نے میرے اس احساس کو سمجھ کر اس کی اصلاح و تعدیل کے لیے ہی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں حاضری اور قیام کی مجھے اتنے اہتمام سے تاکید فرمائی، گویا مجھے ایک عشق باز اور صاحبِ اخلاص بندے کے دین کے درد اور اس راہ میں اس کی تڑپ اور بے کلی کا مشاہدہ کرانا تھا اور دکھانا تھا کہ دین کی خدمت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔

اے مرغِ سحر عشقِ ز پر واندہ بیاموز  
کان سوختہ جاں شد و آواز نیامد

اٹھ نو برس پہلے کا واقعہ ہے، حافظہ نے اب تک جتنا کچھ محفوظ رکھا لکھ دیا ہے، اپنی اور اُن بزرگ کی گفتگو کا جو حصہ نقل کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے عرصے کے بعد اصلی الفاظ میں نقل کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے ان سب کو روایت بالمعنی ہی میں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اس کا بھی قوی امکان ہے کہ اس سلسلہ کی بعض باتیں رہ گئی ہوں اور بعض ایسی باتیں یہاں لکھی گئی ہوں جو اس موضوع پر بعد میں کسی اور صحبت میں اُن بزرگ سے سُنی گئی ہوں۔ بہر حال جو تو صنایع و تشریحات اُن بزرگ کی طرف منسوب کر کے یہاں لکھی گئی ہیں اس کا اطمینان ہے کہ وہ سب اُنہی کی ہیں۔

تقوت کے اعمال و اشغال کے متعلق جس ذاتی تجربہ کا ارادہ کیا گیا تھا،

نہیں ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لا اُبابی پن سے وجہ سے اور کچھ اپنے دیگر

مشاغل کی کثرت اور خاص نوعیت کے سبب سے کما حقہ وہ تجربہ تو نہیں کیا جاسکا، تاہم جو ٹوٹا پھوٹا اور برائے نام سا تعلق اس سلسلے سے اور اُس کے اشغال سے ان چند سالوں میں رہا اور اس کی وجہ سے اس راہ کے بعض اکابر سے جو قرب حاصل رہا اور اُن کے احوال اور ماحول کو قریب سے مطالعہ کرنے کا جو موقع ملا اُس سے چند یقین حاصل ہوئے، جن میں سے بعض تصوف کے منصفین اور منکرین کی خدمت میں عرض کرنے کے قابل ہیں اور بعض خود اہل تصوف کی خدمت میں پیش کرنے ضروری ہیں۔

خدا لگتی بات یہ ہے کہ غریب ”تصوف“ اپنے منکروں اور مخالفوں کا تو مظلوم ہے ہی، لیکن جو اس کے حامل اور علمبردار ہیں، کچھ ان کی بعض چیزیں بھی اس مظلومیت کا باعث بن رہی ہیں۔



# تصوّف اور اس کے اعمال و اشغال کے متعلق میرے چند لفتین

الحمد للہ کہ اب اس باب میں  
 تصوّف کا مقصد اور اس کی حقیقت | کسی طرح کا کوئی شک و شبہ  
 نہیں رہا کہ تصوّف اور اس کے اعمال و اشغال کا اصل مقصد دین کی تکمیل اور  
 خصوصاً ان کیفیات اور ملکات کی تحصیل کے سوا کچھ نہیں ہے جن کو کتاب و  
 سنت ہی میں کمال ایمان و اسلام کی ضروری شرط قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ اس  
 بارے میں بہت سے حضرات کے ذہنوں میں الجھنیں ہیں، اس لیے جو کچھ اس  
 سلسلہ میں میں نے سمجھا ہے اس کو ذرا تفصیل سے عرض کرتا ہوں و باللہ التوفیق۔  
 قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور دین کی  
 تکمیل کے لیے عقائد اور اعمال کی صحت کے علاوہ انسان کے قلب اور  
 باطن میں کچھ خاص کیفیات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً محبت کے بارے  
 میں سورہ بقرہ کی ایک آیت میں ارشاد ہے :-

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ - اور جو ایمان والے ہیں ان کو سب سے

(سورہ بقرہ - ۲۰ - ح)

زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے۔

اور حدیث صحیح میں ہے۔

ثَلَاثٌ مَنْ كُنَ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَتَهُ الْإِيمَانُ ، الْحَدِيثُ -

(یعنی ایمان کی حلاوت اس کو حاصل ہوگی جس میں تین چیزیں موجود ہوں۔

ان میں سے اول یہ کہ اللہ و رسول کی محبت اس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو۔

دوسرے یہ کہ اگر کسی آدمی سے اس کو محبت ہو تو وہ ابھی اللہ ہی کے واسطے

ہو اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف جانا اس کے لیے اتنا ناگوار اور

تکلیف دہ ہو جتنا کہ آگ میں ڈالا جانا۔)

اور سورہ انفال کے پہلے رکوع میں ہے :-

”جیسے ایمان والے بس وہی لوگ ہیں جن کا یہ

حال ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر

کیا جائے تو ان کے دلوں میں خوف کی

کیفیت پیدا ہو اور جب ان کے سامنے

اللہ کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو ان کے

نور ایمان میں زیادتی ہو اور اپنے پروردگار

پر وہ بھروسہ رکھتے ہوں“

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ

إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَّتْ

قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ

عَلَيْهِمْ آيَاتُ اللَّهِ تَوَلَّوْا

وَعَطَّلُوا بِئِمْ يُكَوِّنُهَا

(سورہ انفال - ح ۱)

اور سورہ مؤمنون میں اللہ کے اچھے اور کامیاب بندوں کا ذکر کرتے

ہوئے فرمایا گیا ہے :-



بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کی ہیبت سے  
خوفزدہ رہتے ہیں اور جو اپنے رب کی آیتوں پر  
ایمان رکھتے ہیں اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ کسی  
کو شریک نہیں کرتے ہیں اور وہ جن کا حال یہ  
ہے کہ اللہ کی راہ میں اور نیکی کے کاموں میں  
اپنا مال خرچ کرتے وقت راہی طرح  
دوسرے نیک کاموں میں، انکے دل خائف  
رہتے ہیں کہ انکو اللہ کے حضور میں لوٹ کھجے جانا ہے  
(معلوم) انکے یہ عمل قبول ہوں یا نہ ہوں، وہی لوگ  
بھلائیوں کی طرف تیز گامی کرتے ہیں اور وہی  
ان کے لیے دوڑ کر بڑھنے والے ہیں۔“

إِنَّ الَّذِينَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ  
مُسْتَقْرُونَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ  
يُؤْمِنُونَ وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ  
لَا يُشْرِكُونَ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ  
مِمَّا آتَوْا وَقُلُوبُهُمْ وَجَلَةٌ أَنَّهُمْ  
إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ ۚ أُولَٰئِكَ  
يَسِيرُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ  
لَهَا سَابِقُونَ ۝

(المؤمنون - ع - ۶۴)

اور سورۃ زمر میں ارشاد فرمایا گیا ہے :-

”اس سے ان لوگوں کے بدن کا نیچے لگنے ہیں  
اور روئے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب کے ڈرتے  
ہیں اور پھر ان کا ظاہر و باطن نرم ہو کر اللہ کی  
پلا کی طرف جھک جاتا ہے۔“

تَقْسِرُونَ مِنْهُ جُلُودَ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ  
ثُمَّ تَلَيَّنُّ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ  
إِلَىٰ رُبِّهِمْ ۚ

(زمر - ع - ۳)

اور سورۃ آل عمران میں ارشاد ہے :-

وہ لوگ جن کا یہ حال ہے کہ اللہ کو دہر وقت اور  
ہر حالت میں یاد کرتے اور یاد رکھتے ہیں، کھڑے

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا  
وَعَلَىٰ خُفْيَةٍ ۚ

ٹیٹھے اور بستروں پر لیٹے ہوئے بھی۔“

(دال عمران)

اور سورہ ”مزل“ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے :-

وَاذْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلاً ۝  
وہ اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے  
یکسو ہو کر اسی کی طرف متوجہ رہو۔ (مزل)

ان آیتوں میں جن اوصاف و کیفیات کو اہل ایمان کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے اور جن کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہیں :-

۱۔ ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہو۔

۲۔ اُن کے دل کی یہ حالت ہو کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس میں خوف اور لہزش کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

۳۔ اُن کے سامنے جب آیات الہی کی تلاوت کی جائے تو اُن کے نورِ ایمان میں اضافہ ہو۔

۴۔ اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتے ہوں اور یہ توکل اور اعتماد علی اللہ ہی اُن کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہو۔

۵۔ وہ ہر دم اللہ کی ہیبت سے خوفزدہ رہتے ہوں۔

۶۔ اللہ کا خوف اُن پر اتنا غالب ہو کہ نیکی کرتے وقت بھی اُن کے دل ڈرتے ہوں کہ معلوم نہیں ہماری یہ نیکی قابل قبول بھی ہوگی یا نہیں۔

۷۔ قرآن مجید کی تلاوت یا اُس کی آیتیں سننے سے اُن کے جسم کانپ جاتے ہوں اور اُن کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی طرف اور اُس کی یاد کی

طرف جھک جاتا ہو۔

- ۸۔ وہ ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھتے ہوں اور کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہوتے ہوں۔
- ۹۔ ہر طرف سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا ان کا حال ہو۔

اور قرآن مجید کے علاوہ حدیث کے مستند ذخیرہ میں بھی اس سے زیادہ صفائی اور صراحت کے ساتھ اس قسم کے احوال و کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے :-

من احب لله وابتغى  
الله واعطى الله و  
منع الله فقد استكمل  
الایمان -  
«جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اللہ ہی کے لیے محبت  
کرے (جس سے محبت رکھے) اور اللہ ہی کے لیے  
مبغض رکھے (جس سے مبغض کرے) اور اللہ ہی کے لیے  
دے (جس کو کچھ بھی دے) اور کسی کو کچھ دینے سے  
اللہ کی رضا ہی کے لیے ہاتھ روکے (جس کو بھی دینے  
سے ہاتھ روکے) تو اس نے اپنا ایمان کامل کر لیا۔»

اسی طرح مشہور حدیث جبرئیل میں ایمان اور اسلام کی تکمیل کا نام احسان بتلایا گیا ہے اور اس کی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے :-

ان تعبد الله کانک تراه فان لم  
یکن تراه فانه یراک (بخاری و مسلم)  
احسان کا مقام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اور  
بندگی اس طرح کرو یا اس سے ہر دم اس طرح  
ڈرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگرچہ

تعبداً اللہ - تم اُس کو نہیں دیکھتے ہو، پر وہ تم کو دہرچکے

(فتح الباری) اور ہرآن) دیکھتا ہے ۵۵

پہلی حدیث میں ”اخلاص“ کا ذکر ہے اور دوسری حدیث میں ”احسان“ کا اور یہ دونوں ان ہی احوال و کیفیات میں سے ہیں جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔

دین میں ان احوال و کیفیات کی اس قدر اہمیت ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) ان کے حصول اور ان میں ترقی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا میں فرماتے تھے۔ اس سلسلہ کی یہ چند دُعا ہیں اس عاجز کے نزدیک خاص طور سے غور اور توجہ کے لائق ہیں :-

اللہم اجعل حبک احب الی من  
نفسی و اہلی و من الماع  
البارد - اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ تیری محبت مجھے اپنی  
ذات اور اپنے اہل و عیال سے اور (سخت پائس کے  
وقت) ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب ہو۔

اللہم اجعل حبک احب الاشیاء  
الی کلما و نعشیتک اخون  
الاشیاء عندک و اقطع عنی  
حاجات الدنیا بالنسوق الی  
لقاءک و اذا اقرت اعین  
اهل الدنیا من دنیاہم

اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ ہر قابل محبت چیز سے  
زیادہ تیری محبت مجھے محبوب ہو اور در نیکی قابل  
ہر چیز سے زیادہ مجھے تیرا ڈر اور خوف ہو اور اپنی  
ملاقات کا شوق میرے دل پر ایسا غالب کر دے کہ  
دنیا کی ساری حاجتیں مجھ سے کٹ جائیں اور جب تو  
دنیا والوں کو انکی چاہتی دنیا دیکر ان کی سبکیں

ثنا قرار عینی من  
 عبادتک -  
 ٹھنڈی کرے تو میری آنکھیں اپنی عبادت سے ٹھنڈی کر  
 اور اپنی عبادت کے ذریعہ میرے دل میں سکون اور  
 ٹھنڈک پیدا کر۔“

اللہم اجعلنی اختلاک کافی  
 ادالک ابدًا حتی العالی الخ  
 ”اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ میں اس طرح تجھ سے  
 ڈروں گویا ہر وقت تجھے دیکھ رہا ہوں۔ یہاں تک  
 کہ اسی حال میں تجھ سے جاٹوں۔“

اللہم انی اسألك  
 ایمانا یا شہرتی و  
 یقینا ما دقا حق  
 اعلم انہ لا یصیبنی  
 الا ما کتبت لی ورضا  
 من المعیشة بما  
 قسمت لی -  
 ”اے اللہ! میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں جو  
 میرے دل میں پوست ہو جائے اور وہ سچا یقین  
 مانگتا ہوں جس کے بعد میرے دل کو اس بات کا یقین اور  
 قطعی علم حاصل ہو جائے کہ جو پر صحت وہی حالت آسکتی  
 ہے اور آسکتی جو تو نے میرے لیے لکھ دی ہے (یعنی عظیم  
 میرے دل کا حال ہو جائے) اور اس دنیا میں جس  
 قسم کا گزارہ تو نے میرے لیے مقرر اور مقدر کر دیا  
 ہے میں اس پر اپنے دل کی رضا تجھ سے مانگتا ہوں۔“

اللہم انی اسألك التوفیق  
 لبعابک من الاعمال وصدق  
 ”اے اللہ! جو اعمال تجھے پسند ہیں میں ان کی توفیق تجھ سے  
 مانگتا ہوں اور سچے ٹکلی کا تجھ سے سوال کرتا ہوں اور

التوکل علیک وحسن ظنّ بک - تیرے ساتھ حُسن ظن کی تجھ سے ہی استدعا کرتا ہوں۔

اللّٰهُمَّ اِنِ اسْأَلْتُكَ نَفْسًا بِكَ  
مَطْمَئِنَّةٍ تَوْمِنٌ بِلِقَائِكَ  
وَتَرْضَى لِقْفَانًا وَتَقْنَعُ  
بِعَطَائِكَ - اے اللہ! میں تجھ سے ایسا نفس مانگتا ہوں جسے  
تجھ ہی سے اطمینان اور اس حاصل ہو، جسے تیری  
ملاقات پر سچا ایمان اور یقین نصیب ہو  
جو تیری قضاء و قدر پر راضی ہو اور جو  
تیری دین پر قانع ہو۔

اللّٰهُمَّ افْتَحْ مَسَامِعَ قَلْبِي لِذِكْرِكَ  
اے اللہ! میرے دل کے کان اپنے ذکر کیلئے کھول دے۔

اللّٰهُمَّ اِنِ اسْأَلْتُكَ قَلْبًا  
اَوْاهَةً مَخْبِئَةً مَنِيْبَةً فِي  
سَبِيْلِكَ - اے اللہ! میں تجھ سے ایسے قلوب کا سوال کرتا ہوں جو نرم  
اور درد آشنا ہوں، ٹوٹے ہوئے ہوں اور تیری  
طرح رجوع کرنے والے ہوں۔

اللّٰهُمَّ اجْعَلْ وَسْوَاسَ قَلْبِي  
خَشِيْتِكَ وَذِكْرَكَ وَاجْعَلْ  
هَمَّتِي وَهَوَايَ فِيمَا تُحِبُّ  
وَتَرْضَى - اے اللہ! میرے دل میں خطرے اور خیالات بھی بس تیرے  
خوف اور تیری یاد ہی کے آئیں اور میری تمام تر  
توجہ اور چاہت ان ہی چیزوں کی طرف ہو جو تجھے  
محبوب ہوں اور جن سے تو راضی ہو۔

اللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِي قَلْبِي نُورًا مِّنْ نُّوْرِكَ  
وَأَجْعَلْنِي نُورًا - اے اللہ! میرے قلب میں نور بفرما، اور مجھے نور عطا  
فرما، اور مجھے مرا یا نور بنا دے۔

یہ سب دعائیں (اور اس قسم کی بیسیوں دعائیں) کتبِ حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مروی ہیں۔ آپ خود بھی یہ دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتے تھے اور امت کو ان دعاؤں کی تعلیم و تلقین بھی فرماتے تھے۔

ان دعاؤں میں جن چیزوں کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا گیا ہے، وہ سب انسان کے باطن اور قلب کی خاص کیفیات ہیں۔ مثلاً ہر چیز سے زیادہ اللہ کی محبت، ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا خوف، اللہ سے شوقِ ملاقات کا ایسا غلبہ کہ دنیا کی ضروریات اور خواہشات فراموش یا فنا ہو جائیں۔ عبادت میں آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون ملنا، اللہ تعالیٰ سے ہر دم اس طرح ڈرنا کہ گویا وہ اپنے جلال و جبروت کے ساتھ ہماری نگاہ کے سامنے ہے، یقینِ صادق، رضا بالقضا، توکل علی اللہ، حُسن ظن باللہ، نفس کا اللہ تعالیٰ سے مطمئن اور مانوس ہونا اور اُس کی عطا پر قانع ہونا۔ ذکر اللہ سے قلب کا اثر لینا۔ اُس کا درد آشنا اور ٹوٹا ہوا اور جھکا ہوا ہونا۔ اللہ سے قلب کا تعلق اس درجہ ہو جانا کہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کا خوف، دساؤس اور خطرات کی جگہ بھی لے لے اور بندہ کا محی صرف انہی چیزوں کو چاہے جو اللہ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہیں۔ نور سے قلب کا معمور ہو جانا۔

ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا تعلق نہ عقائد کے باب سے ہے، نہ اعمال کے باب سے بلکہ یہ سب قلبی کیفیات اور احوال ہیں اور دین میں اُن کی اتنی اہمیت ہے کہ اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ سے ان کا سوال کرتے ہیں۔

پس تصوّف دراصل اس قسم کی چیزوں کی تحصیل کا ذریعہ ہے اور اس کے خاص اعمال و اشغال (مثلاً صحبتِ شیخ اور کثرتِ ذکر و فکر) کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ ان کیفیات کے پیدا کرنے کی تدبیریں ہیں۔ ایسی جن کی تجربہ تصدّیق کرتا ہے اور صاف ذہن رکھنے والے لوگوں کے لیے اُن کی نفسیاتی اور عقلی توجیہ بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی غالباً ناظرین کے لیے مفید ہوگا کہ مندرجہ بالا آیات و احادیث اور دُعاؤں سے جن قلبی کیفیات کا دین میں مطلوب و مقصود ہونا ابھی معلوم ہو چکا ہے۔ اُن میں سے چند مثلاً عشق اور یقین اور قلب کی رقت اور سوز و گداز یہ تو اصل و بنیاد کا درجہ رکھتی ہیں اور باقی زیادہ تر اُن کے نتائج اور لوازم ہیں۔ اس لیے تصوّف کے ان اعمال و اشغال کے ذریعہ براہِ راست صرف ان بنیادی کیفیات ہی کو قلب میں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کے بعد باقی چیزیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے وہ اصولی نظریہ جس پر تصوّف کی بنیاد ہے اور جس کی بناء پر اس کو دین کا تکمیلی شعبہ بھی سمجھا جاتا ہے

یہ عاجز بلا کسی اکتساہ کے عرض کرتا ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لا اُبالی پن اور کچھ خاص حالات کی وجہ سے چونکہ میں اس سلسلہ کے تجربہ کی طرف پوری توجیہ

لے عقلی توجیہ کے لیے مرادِ مستقیم (مرتبہ شاہ اسمعیل شہید) کے چند ابتدائی اوراق کا مطالعہ بھی

انشاء اللہ تمہارے کسی درجہ میں کافی ہوگا۔ ۱۷



نہیں دے سکا۔ اس لیے خود تو ان کیفیات سے خالی اور محروم ہی ہوں، لیکن جو تھوڑی سی اور برائے نام توجہ کی جاسکی اور اس راہ کے بعض اکابرین کی خدمت میں کبھی کبھی حاضری کی جو توفیق اس سلسلے میں ملتی رہی ہے، اسی سے الحمد للہ یہ یقین اور اطمینان حاصل ہو گیا کہ تقویٰ اور اس کے اعمال و اشغال کی غرض و غایت اور ان کی حقیقت کے متعلق ان بزرگ نے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ صحیح ہے۔

(۲) اور دل و دماغ نے یہ بھی مان لیا کہ تقویٰ کے ذریعہ جن قلبی کیفیات اور ملکات کی تحصیل کی کوشش کی جاتی ہے، دین کی تکمیل اور ایمانی صلاوت کا حصول ان پر موقوف ہے۔

(۳) اس کا بھی یقین حاصل ہوا کہ تقویٰ ایمان و اسلام کی تکمیل کے علاوہ ایک خاص قسم کی دُوح اور طاقت پیدا کرنے کا بھی ذریعہ ہے اور اگر صلاحیت اور طبیعت کو مناسب ہو تو یقین اور اعتماد، ہمت و عزیمت، صبر و توکل اور ماسویٰ اللہ سے بے خوفی جیسے اوصاف (جو طاقت کا سرچشمہ ہیں) تقویٰ کے ذریعے ان کو پیدا کیا جاسکتا ہے اور اُبھارا جاسکتا ہے۔ اسی لیے تقویٰ کو اپنانے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کا سب سے بڑا حق میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کو ہے جو بے دینی کی اس دُنیا میں انبیاء علیہم السلام کے طرز اور طریقے پر کسی بڑی اصلاحی تبدیلی کے لیے مصروفِ جد و جہد ہوں اور وہ پرستی کی فضا کو خدا پرستی کی فضا سے بدلنا چاہتے ہیں۔

۴) تصوف سے دُوری اور بے خبری کے دُور میں میری یہ رائے تھی کہ تصوف کا قالب ہم کو بدل دینا چاہیے اور اُس کی رُوح کو برقرار رکھتے ہوئے ایک نئے سانچے میں اُس کو ڈھال دینا چاہیے۔ لیکن بعد میں جب تصوف اور اُس کے حاملین سے کچھ قرب پیدا ہوا تو معلوم ہوا کہ صورت اور قالب میں ترمیم اور تبدیلی کا عمل برابر جاری ہے اور خود ہماری اس مدی میں بھی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی وغیرہ نے اپنے تجربہ اور اجتہاد سے اس میں بہت کچھ تجدید و ترمیم کی ہے اور زمانہ حاضر کے تقاضے کے مطابق اس کو بہت مختصر اور سائنٹیفک کر دیا ہے اور اب بھی یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور بلاشبہ سلوک میں تجدید کے اس سلسلہ کو برابر جاری رہنا چاہیے۔ لیکن اس کا اب پورا پورا یقین ہو گیا کہ یہ کام صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جو اس فن کے امام اور خود اس سمندر کے ثناور ہوں، ورنہ اگر اس خدمت کی ذمہ داری میرے ایسے حضرات نے لے لی جنہوں نے نہ اس شعبہ کی تکمیل کی ہے اور نہ اُس کے ساتھ اُن کا گہرا عملی تعلق رہا ہے تو اس کا بڑا امکان ہے کہ اخلاص اور ذہانت کے باوجود تصوف میں ان کی اصلاح و ترمیم خدائے حق سے ہی ممکن ہو جیسی کسی روایتی بڑھیلے شاہی باز کی مرمت کی جاتی۔

۵) تصوف اور اہل تصوف سے قریب ہونیکے بعد جن چند باتوں کا یقین حاصل ہوا۔ اُن میں سے ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی پڑھا لکھا اور کیسا ہی ذہین فطین ہو۔ تصوف سے صحیح واقفیت حاصل کرنے اور اس کے مالہ و ماعلیہ کو علی وجہ البصیرت جاننے کے لیے اس کو بھی اس کی

ضرورت ہے کہ تصوف کی حامل کسی شخصیت کی صحبت اور خدمت میں اس کا کچھ وقت گزے اور اس شعبہ کا عملی تجربہ حاصل کرنے پر بھی وہ زندگی کے کچھ دن صرف کرے، اس کے بغیر تصوف کو پوری طرح سمجھا اور جانا نہیں جاسکتا۔

جن صاحب ارشاد بزرگ کی خانقاہ میں اپنی حاضری کا ذکر گزشتہ صفحات میں راقم سطور کر چکا ہے۔ ایک موقع پر میرے ہی ایک سوال کے جواب میں موصوف نے اس حقیقت کو ان لفظوں میں ادا فرمایا تھا :-  
 ”گھر کے اندر کی چیزوں کا پورا علم تو گھر میں داخل ہو کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے“

الغرض تھوڑے سے ہی تجربے سے ارباب تصوف و سلوک کے اس مشہور مقولہ کی تصدیق حاصل ہوگئی کہ من لہ یدق لہ ید یعنی لذت میں نہ شناسی بخدا تا نہ چشی، ”کچھ دن ہونے ایک بڑے اچھے ذی علم اور ذہین، صاحب قلم دوست کی ایک تحریر کے مطالعہ کا اتفاق ہوا تھا جس میں انہوں نے تصوف پر اظہار خیال کر رہا تھا۔ کم از کم ناچیز کو تو ایسا کچھ محسوس ہوا کہ کوئی بڑا ذہین، پتہ کسی ایسے موضوع پر اظہار خیال کر رہا ہے، جس کے مبادی سے مجھ واقفیت حاصل کرنے کا اس کو موقع نہیں ملا ہے، مگر پھر بھی اُس کی ذہانت قابلِ داد ہے۔“

(۶) تصوف اور اُس کے بعض حلقوں کے اس چند ریزہ ہی قرب و تعلق سے یہ بھی

پہلے ہی طرح دیکھ کے دوسرے شعبے کی طرف اچھی صلاحیتیں رکھنے والے افراد

فی زمانہ بہت کم متوجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً دیکھا جا رہا ہے کہ علم دین کے طالبوں اور علی ہذا دین کی دعوت و خدمت کی طرف توجہ کرنے والوں میں بہت بڑی تعداد آج کل اُن ہی بے چاروں کی ہوتی ہے جو صلاحیتوں کے لحاظ سے بہت ادنیٰ اور پست درجہ کے ہوتے ہیں۔ بالکل یہی، بلکہ شاید دین کے دوسرے شعبوں سے زیادہ افسوسناک اور ابتر حال اس لحاظ سے دین کے اس شعبہ (تقوٰت) کا بھی ہے۔ اس وقت اُن ”خانقاہوں“ سے بحث نہیں، جو دراصل دھوکہ فریب کی دکانیں ہیں اور جہاں اولیاء اللہ کے نام پر شرک و بدعت کا کاروبار ہوتا ہے اور نہ یہاں اُن نااہل موردی سجادہ نشینوں اور پیشیہ ور پیروں، مٹوفیوں کا ذکر ہے جو تقوٰت کے نام اور بزرگوں کی نسبت کی تجارت کرتے ہیں، بلکہ جو واقعی مشائخ حق اور صاحب ارشاد ہیں۔ اُن کے پاس بھی جو طالب بن کر اب آتے ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ (شاذ و نادر مثالوں کو مستثنیٰ کر کے) دل و دماغ کی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ بے چارے عموماً نیچی ہی سطح کے ہوتے ہیں اور اگرچہ اپنے اخلاص اور اپنی صادق طلب اور محنت سے ان میں سے بھی بہت سے اس شعبہ کی کچھ برکتیں ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ وہ بے چارے خانقاہی فیضان و تربیت کا ایسا نمونہ تو نہیں بن سکتے ہیں جن کا حال اور قال خانقاہیت کی بدنامی اور تقوٰت و روحانیت بیزاری کے اس دور میں دین کے اس شعبہ کی اہمیت اور افادیت تسلیم کرنے پر لوگوں کو مجبور کر دے۔

اصولی بات ہے کہ جو کام جتنا زیادہ بلند اور لطیف و نازک ہو اُس کے کر نیوالے بھی اُسی درجہ کے ہونے چاہئیں۔ موجودہ دور میں تقوٰت کی ناکامی

اور بدنامی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ جو اسکے اہل ہیں وہ توجہ نہیں کرتے۔ اور جو بے چارے توجہ کرتے ہیں عموماً ان کی صلاحیتیں معمولی ہوتی ہیں لیکن دنیا ان ہی کو پھل سمجھ کر اصل درخت کے متعلق رائے قائم کرتی ہے۔

(۷) اس موقع پر ایک چیز خود مشاخر کرام کے متعلق بھی ناظرین سے بے تکلف عرض کرنا ضروری ہے :-

جس طرح دنیا میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کامیاب و کیلی ہو، وہ اچھا ڈاکٹر بھی ہو اور جو بالغ النظر فلسفی ہو وہ سیاسیات یا معاشیات کا ماہر بھی ہو اور جو ماہر فن انجینئر ہو وہ اچھا ادیب اور شاعر بھی ہو۔ بعینہ یہی حال دین کے مختلف شعبوں کا بھی ہے، بالکل ضروری نہیں ہے کہ جو شخص وسیع النظر عالم اور بلند پایہ محدث یا فقیہ ہو وہ تصوف میں بھی خاص دستگاہ رکھتا ہو یا جو صاحب قلب صوفی اور عارف ہو۔ وہ اسلامی قانون کا ماہر بھی ہو اور عبد حاضر کے اہم مسائل کے بارہ میں دینی نقطہ نظر سے صحیح رائے قائم کرنے والی مجتہدانہ فکر و بصیرت بھی رکھتا ہو۔ بلکہ حقائق اور واقعات کی اس دنیا میں پہلے بھی اکثر ایسا ہی ہوا ہے اور ہمارے اس زمانہ میں تو تقریباً ۹۵% فیصد ایسا ہی ہے کہ جو کسی ایک شعبہ میں ماہر اور کامل ہوتا ہے وہ دوسرے شعبوں میں اکثر خام ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اس زمانہ میں ایسے لوگ اکثر مایوس اور محروم ہمارے ہتے ہیں جو صرف کسی ایسے ہی شخص سے استفادہ کرنا چاہتے ہوں جو ان کے مفروضہ معیار کے مطابق ہر جہت سے کامل مکمل ہو۔

بلکہ آتا ہے راقم سطور نے اپنے ایک محترم دوست سے اس موضوع پر

گفتگو کرتے ہوئے ایک دفعہ عرض کیا تھا :-

دد آپ ماضی اور حال کے متعدد ایسے حضرات سے یقیناً واقف ہیں جن کی زندگی آپ کی نظر میں دین اور تقویٰ کا کوئی اچھا اور قابلِ تقلید نمونہ نہیں ہے اور بالخصوص اخلاص و احسان اور توکل و تسلیم جیسی اعلیٰ ایمانی صفات و کیفیات میں آپ کے نزدیک ان حضرات کا کوئی بھی خاص یا عام مقام نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اُن کا علم و فکر اور ان کی خدا داد ذہانت اور بصیرت آپ کے خیال میں قابلِ استفادہ ہے اور ہم آپ ان کی چیزوں سے برابر استفادہ کرتے ہیں اور اُن لوگوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں جو صرف اُن کے علمی اور تحقیقی کوششوں سے اس لیے فائدہ نہیں اُٹھاتے کہ وہ اُن کی نیک خواہش کے مطابق کوئی بڑے بزرگ اور صوفی قسم کے آدمی نہیں ہیں۔ اسی طرح ہم اللہ کے کچھ بندوں کو ایسا پاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں تقویٰ اور سلوک پر زیادہ توجہ دی اور کسی شیخِ کامل کی پہنچائی اور نگرانی میں اپنے وقت اور اپنی قوتوں کا بڑا حصہ اس شعبہ کی تحصیل اور تکمیل پر صرف کیا اور اس لیے اس میں انہیں اختصاص اور امتیاز کا مقام حاصل ہو گیا۔ لیکن کسی دوسرے شعبے میں مثلاً علم و فکر ہی میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہیں کوئی خاص بلندی حاصل نہیں ہے اور اس لیے دین کی بعض ضرورتوں کو جن کو ہم بہت اہم سمجھتے ہیں،

وہ اچھی طرح محسوس بھی نہیں کرتے اور ملت کے مشکل اور اہم اجتماعی مسائل میں وہ بہتر رہنمائی نہیں کر سکتے یا فرض کیجئے کہ مطالعہ یا غور و توجہ کی کمی کی وجہ سے وہ وقت کے بہت سے اہم معاملات کو صحیح طور پر سمجھتے بھی نہیں تو ان کامیوں کو دیکھ کر ان کے اس کمال کی بھی نفی کرنا جو واقع میں ان کو حاصل ہے اور اپنی احتیاج کے باوجود اس شعبہ میں بھی ان سے ہمارا استفادہ نہ کرنا ان ہی لوگوں کی جیسی عامیانہ غلطی ہے جن کو تنگ نظری اور تاریک خیالی کامرینی سمجھا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جی تو اپنا بھی یہی چاہتا ہے اور ہر اچھا بھلا آدمی یہی چاہتا ہے کہ جو شیخ خانقاہ اور عارف حق آگاہ ہو وہ بلند پایہ مفسر و محدث اور بالغ النظر فقیہ و مجتہد بھی ہو، بلکہ ساتھ ہی ملت کی قیادت اور امانت کبریٰ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی بھی پوری صلاحیتیں رکھتا ہو اور اسی طرح جو اچھی نظر و فکر رکھنے والا عالم دین ہو وہ اسلامی شریعت و قانون میں مہارت رکھنے کے علاوہ اُمت کی قیادت اور حکومت کے نظام کو چلانے کی اعلیٰ صلاحیت بھی رکھتا ہو اور مزید براں اپنے قلب و باطن کے لحاظ سے اپنے دور کا جنید و بایزید بھی ہو۔ لیکن یہ تو صرف ہمارے جی کی چاہت اور ایک خوشگوار تمنا ہوتی۔ اور یہ دُنیا جس میں ہم رہتے ہیں وہ خیالات اور تمناؤں کی دُنیا نہیں ہے۔ بلکہ حقائق و واقعات کی دُنیا ہے اور عملی آدمی کو اپنا طرزِ عمل و واقعات ہی کی اس دُنیا کو سامنے رکھ کر متعین کرنا چاہیے۔

جن صاحب خانقاہ بزرگ کی خدمت میں اپنی حاضری کا ذکر راقم سطور نے

گزشتہ صفحات میں کیا ہے، ان ہی کی زبان سے کئی بار یہ حکیمانہ ارشاد سنا ہے :-  
 ”یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ کسی ایک ہی دکان پر سب سودے  
 اچھے مل سکیں، اس لیے جو سودا جس دکان پر اچھا ملے اُس کے لیے  
 اُدھی کو اسی دکان پر جانا چاہیے۔“

یہاں تک جو کچھ عرض کیا اُس میں راقم کا دُوئے سخن تقوٰت کے مخلص  
 ناقدین اور منکرین کی طرف تھا۔ اب اپنے تجربہ ہی کے چند نتیجے اور چند تاثرات  
 تقوٰت کے حاملوں اور حامیوں سے بھی عرض کرنے ہیں۔

(۸) تقوٰت کے مقصد اور اس کی حیثیت کے متعلق جو کچھ پہلے عرض کیا ہے اگرچہ  
 خود اپنے کو بھلائی میں شک نہیں رہا ہے کہ اصلیت وہی ہے۔ لیکن بعض  
 مشائخ حق اور ان کی خانقاہوں سے طلب اور عقیدت کا تعلق رکھنے والوں میں  
 بھی بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جن کا ذہن اس بارے میں صاف نہیں ہوتا  
 اور وہ طرح طرح کی غلط خیالیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً تقوٰت کے جن  
 اعمال و اشغال کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بعض کیفیات پیدا کرنے  
 کا وہ ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ خانقاہی حلقوں میں بکثرت ایسے لوگ ملتے ہیں،  
 جو ان اعمال و اشغال ہی کو گویا اصل سلوک سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ان اعمال و  
 اشغال اذکار کے بعض وہ آثار جن کے متعلق تمام مشائخ محققین یہ فرماتے ہیں :-  
 ”در ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرح کے ادھام و

خیالات ہیں۔“

تقوٰت کے ہمارے حلقوں میں تعلق رکھنے والے بہت سے حضرات ان ہی کی



طلب میں اُچھے ہوئے ملتے ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سی غلطیاں اور الجھنیں ہیں جن میں خانقاہی طالبین بکثرت مبتلا ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بعض بزرگ ذہنوں کی صفائی کی طرف پوری توجہ نہیں فرماتے، حالانکہ یہ بڑے اہم درجے کی ضرورت ہے اور اس ناچیز کا خیال ہے کہ سلوک و طریقت کے جن حلقوں میں پہلے کبھی گمراہیوں نے جگہ پائی ہے، وہ بعض ایسے بزرگوں کی اسی قسم کی بے توجہی کا نتیجہ ہے، جو خود ہمارے نزدیک ان گمراہیوں میں مبتلا نہ تھے۔ تصوف کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ مشائخ اگر پوری طرح چوکے نہ رہیں اور اپنے طالبین اور معتقدین کے ذہنوں کی صفائی اور خیالات کی اصلاح کی فکر نہ رکھیں تو شیطان کی گمراہ کرنے والی کوششیں اس حلقے میں بڑی آسانی سے کامیاب ہو سکتی ہیں۔ بہر حال ہمارے بزرگوں کو اس خطرے سے غفلت نہیں برتنی چاہیے اور اذہان و خیالات کی صفائی اور اصلاح کو ذکر و شغل سے بھی مقدم سمجھنا چاہیے۔

(۹) ائمہ تصوف امام ربانی اور حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اس پر بڑا زور دیا ہے کہ طالب کو پہلے ضروری عقائد کی تصحیح اور بقدر ضرورت علم دین حاصل کرنا چاہیے اور اس کو شیخ کے فرائض میں گمراہی سے کہ وہ اگر طالب اور مرید میں یہ کی دیکھے تو اس کو اس طرف متوجہ کرے لیکن بعض مشائخ کے یہاں ان ذمہ داری کا احساس اور اس کے عملی اہتمام میں بہت کمی دیکھنے میں آئی۔ بہت سے بیچارے سیدھے سادے ایسے بندے ان کی خدمت میں بیعت کے لیے آتے ہیں جن کی باتوں سے اور جن کے ظاہری حال سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان بے چاروں کو دین کی وہ ضروری اور بنیادی باتیں بھی معلوم نہیں جو ہر مسلمان کو معلوم ہونا

چاہئیں اور بہت واضح اندازہ اس بات کا ہوتا ہے کہ غالباً ان کو صحیح نماز پڑھنا بھی نہ آتا ہوگا۔ لیکن کبھی کبھی دیکھا گیا ہے کہ ایسوں کو بھی مشائخ کے عام طریقے پر تجدید ایمان اور توبہ کر کے بس بیعت کر لیا گیا اور پڑھنے کے لیے کوئی تسبیح اُن کو بتا دی گئی اور بقدر ضرورت دین سیکھنے کی طرف نہ کوئی توجہ دلائی گئی اور نہ اس کا کوئی انتظام فرمایا گیا۔ حالانکہ ان حضرات کے لیے یہ بہت آسان ہے کہ ایسے جو لوگ بھی اُن کے پاس آئیں اُن کو دو چار دن کے لیے روک کر اُن کی ضروری تعلیم (عقائد اور نماز کی تصحیح وغیرہ) کسی خادم کے سپرد کر دی جائے۔ جیسا کہ نئے آنے والوں کے متعلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دستور تھا۔

مکن ہے کہ ان بزرگوں کی اس بے توجہی کا سبب یہ ہو کہ ان انیوالوں کی اس درجہ جہالت اور دین کی بنیادی چیزوں سے بھی اتنی ناواقفیت کا ان حضرات کو اندازہ نہ ہوتا ہو، لیکن عرض یہی کرنا ہے کہ اس طرف ان حضرات کی توجہ کامبذول نہ ہونا اور اس پہلو پر نظر نہ کرنا۔ ان کے ذمہ دارانہ منصب کے شایان شان نہیں۔

(۱۰) تصوف کی تاریخ پر جب حضرات کی نظر ہے اُن سے یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ مختلف زمانوں میں اس راہ سے کسی کسی گمراہیاں اُمت میں داخل ہوتی ہیں اور آج بھی اپنے کو تصوف و صوفیاء کی طرف منسوب کرنے والوں میں کتنی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کے تصورات اور اعمال، اسلام اور توحید کی نسبت کفر اور شرک سے زیادہ قریب ہیں۔ اللہ نے جنہیں واقفیت اور بصیرت دی ہے وہ جانتے ہیں کہ خانقاہی حلقوں میں اس قسم کی گمراہیاں زیادہ تر بزرگوں کے ساتھ عقیدت

اور خوش اعتقادی میں غلو اور تعظیم میں افراط سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے شریعت و سنت کے حامل اور اپنی دینی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے والے مشائخِ حق کا یہ خاص الخاص فریضہ ہے کہ وہ اپنے سے تعلق و محبت رکھنے والوں کو اعتقادی اور علمی غلو اور افراط کی اس بیماری سے محفوظ رکھنے کی طرف ہمیشہ پوری بیداری کے ساتھ متوجہ رہیں اور اس معاملہ میں ہرگز تساہل سے کام نہ لیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہمارے بزرگوں کے سامنے رہنا چاہیے۔

حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ کسی صحابی کی زبان سے نکل گیا "ماشاء اللہ وشتت" (یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں) حضورؐ نے اُن کو سخت تنبیہ کی، اور فرمایا: "جعلتني لله ندا ابل ماشاء الله" "تو نے مجھے اللہ کے برابر بنا دیا، بلکہ یہ کہو وحده۔" کہ "جو تمنا خدا چاہے"۔

ایسے ہی ایک اور موقع پر بعض صحابہ کو تنبیہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لا يستهوينكم الشيطان  
انا محمد بن عبد الله عبد الله  
ودموله ما احب ان توفوني  
فوق منزلتي التي  
انزلني الله۔

لوگو! تمہیں شیطان گمراہ نہ کرے اور تم اُس کے ہرکائے بہک نہ جاؤ۔ میں عبد اللہ کا بیٹا محمد ہوں۔ اللہ کا بندہ اور میں اُس کا رسول ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے اس درجے اوپر اٹھاؤ جہاں خدا نے مجھے رکھا ہے۔

اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کتنی با ایک بین تھی اور کس قدر محتاط تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے جو صحیح میں مروی ہے، کہ

جس روز آپ کے صاحبزادے ابراہیمؑ (علیہ السلام) کی وفات ہوئی۔ اتفاق سے اسی روز سورج کو گمن لگ گیا اور آپ کو شبہ ہوا کہ لوگ کہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ سورج کو یہ گمن بیت نبویؐ کے اس حادثہ کی وجہ سے لگا ہے، تو آپ نے اسی وقت اعلان کر کے لوگوں کو مسجد میں جمع کرایا اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد اعلان فرمایا :-

ان الشمس والقمر آياتان  
من آیات اللہ لہ ینکسفان  
لہ موت احد و لہ لہ حیاتہ -  
الح

”چاند اور سورج اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت و حیات سے ان کو گمن نہیں لگتا بلکہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے حساب کے مطابق اور اس کے حکم سے ایسا ہوتا ہے۔“ الح

چونکہ امت کے تمام طبقوں میں صرف مشائخ ہی کا طبقہ ایسا ہے جس کے ساتھ عقیدت میں لوگوں کو اس قسم کا غلو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے، اس لیے ان حضرات کا یہ خاص الخاص فریضہ ہے کہ اس بارے میں اپنی ذمہ داری اور مسئولیت ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔



(۳)

# تصوّف اور اُس کے اعمال و اشغال کے متعلق بعض شبہات

”یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے جب الفرقان“ کے صفحات میں  
یہ شائع ہوا تو بعض دوستوں کی طرف سے کچھ سوالات  
اس سلسلہ میں کئے گئے اور الفرقان میں اس  
عاجز نے اُن کے جوابات دیئے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن  
جوابات کو بھی اس کتابچہ کا جزو بنا دیا جائے“ (مؤلف)

۱۔ ایک صاحب نے تحریر فرمایا ہے :-

”تصوّف کی جو اہمیت آپ کے اس مقالہ سے ظاہر ہوتی ہے  
اگر واقعہً اس کی اتنی ہی اہمیت ہے تو رسول اللہ (صلی اللہ  
علیہ وسلم) نے اس کے متعلق اور اس کے اعمال و اشغال سے  
متعلق صریح احکام کیوں نہیں دیئے؟ یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں

آتی کہ کوئی چیز دین میں اس قدر ضروری ہو کہ ایمان و اسلام کی تکمیل اُس پر موقوف ہو اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُمت کو اس کی تعلیم نہ دی ہو۔“

معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحب نے میرے مقالہ کو بالکل غور سے نہیں پڑھا میں نے یہیں جو کچھ لکھا ہے اُس کا تو حال ہی یہ ہے کہ تصوف کا جو مقصود ہے اور جو اس کی غایت اور غرض ہے (یعنی اللہ کی محبت و خشیت اور یقین و استحضار اور اخلاص و احسان جیسی کیفیات کا حاصل کرنا) سو اس کی تو دین میں اہمیت ہے اور یقیناً ایمان و اسلام کی تکمیل اس پر موقوف ہے اور بلاشبہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ اُمت کو اس کی تعلیم اور ترغیب بھی دی ہے۔ کتاب و سنت کے جو نصوص اس سلسلہ میں پہلے لکھے جا چکے ہیں، وہ اس کے ثبوت کے لیے کافی سے زائد ہیں۔ رہے اس کے خاص اعمال و اشغال (مثلاً اذکار و مراقبات وغیرہ) تو میں یہ صراحت سے لکھ چکا ہوں کہ یہ اس کے صرف وسائل اور ذرائع ہیں اور اس قسم کے ذرائع اور وسائل کے متعلق نبوی طریق تعلیم اور اصول تشریح کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی تصریح اور تعیین نہ کی جائے، تاکہ ہر زمانہ کے حالات کے مطابق جو جائز ذرائع اور وسائل مناسب سمجھے جائیں انہیں اختیار کیا جاسکے اور اُس میں تعوت کی کوئی خصوصیت نہیں، بلکہ دین کے دوسرے شعبوں کا حال بھی یہی ہے۔

غور فرمایا جائے دین کا سیکنا سکھانا دین کے بنیادی فرائض میں ہے، لیکن کتاب و سنت میں اس کے طریقے کی بھی کوئی تعیین نہیں کی گئی۔

اسی طرح قرآن مجید کی حفاظت اور اشاعت اُمت کا کتنا اہم فریضہ ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق بھی یہ نہیں بتلایا کہ تم اس کے لیے فلاں فلاں طریقے اختیار کرنا، حتیٰ کہ جب عہدِ صدیقیؓ میں یمامہ کی جنگ میں چار سو محافظ قرآن صحابہ شہید ہو گئے، تو سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خیال ہو کہ سینوں میں محفوظ کرنے کے علاوہ ہمیں قرآن کو سفینوں میں محفوظ کرنے کا بھی انتظام کرنا چاہیے اور اس سلسلہ میں خاص اہتمام اور ذمہ داری سے ایک سرکاری نسخہ بھی تیار ہونا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی یہ تجویز حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سامنے پیش کی۔ حضرت صدیقؓ کو ابتداءً اس کے ماننے میں تامل ہوا اور انہوں نے یہی فرمایا کہ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو خود کیا اور نہ ہمیں اس کا حکم دیا۔ اس کو ہم کیوں کریں۔ لیکن حضرت عمرؓ کے دلائل سے بالآخر وہ مطمئن ہو گئے اور پھر ان ہی کے حکم سے حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی خاص نگرانی میں یہ کام انجام پایا۔

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں ایک اور قدم اٹھایا کہ اپنے خاص اہتمام سے اور اپنی نگرانی میں اس مصحف کی نقلیں کر کر تمام بلادِ اسلامیہ میں روانہ کیں اور اُس وقت سے لے کر اب تک قرآن مجید کی حفاظت و اشاعت، تعلیم و تبلیغ اور ترجمہ و تفسیر کے سلسلہ میں خدمتِ قرآن کے کتنے ہی نئے نئے قدم اٹھائے جا چکے ہیں۔

پس یہ خیال کہ جو چیز دین میں اہم ہو اُس کے ذرائع اور وسائل کی تفریح

اور تعین بھی کتاب و سنت میں ہونی چاہیے اور امت کی قیامت تک کی دینی ضروریات کے متعلق تفصیلی اور جزئی ہدایات ہمیں تصریح اور تعین کے ساتھ کتاب و سنت میں ملنی چاہئیں۔ بہت ہی سطحی قسم کا مغالطہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کے طریق تعلیم اور اصول تشریح سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔

۲۔ ایک صاحب نے دریافت کیا ہے کہ :-

رد اللہ تعالیٰ کی محبت و خشیت اور اخلاص و احسان وغیرہ ایمانی کیفیات پیدا کرنے کے لیے تقویٰ میں جن اعمال و اشغال (مثلاً صحبت شیخ اور اذکار و مراقبات وغیرہ) پر زور دیا جاتا ہے، کیا کتاب و سنت میں کہیں اس کا اشارہ ملتا ہے کہ ان چیزوں سے یہ کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں؟

اس کے جواب میں عرض ہے کہ اگرچہ واقعہ یہی ہے کہ اس عاجز کے نزدیک صحبت اور ذکر و فکر کا قلب پر اثر انداز ہونا کتاب و سنت سے اشارہ ہی نہیں بلکہ ملاحظہ بھی معلوم اور ثابت ہے، لیکن اگر بالفرض کتاب و سنت میں اس کا کوئی اشارہ بھی نہ ہو تب بھی اصل مدعا پر کوئی

۱۔ حدیث میں ہے کہ حضرت حنظلہ صحابی اور حضرت صدیق اکبر اپنا حال یہ پلٹتے تھے کہ  
(بقیہ صفحہ پر)



اثر نہیں پڑتا۔ جب اسلام کی تیرہ سو سال کی تاریخ میں اللہ کے لاکھوں صالح بندے اپنا یہ تجربہ بیان کر رہے ہیں کہ ان اعمالِ صالح سے یہ کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں تو ان کی اس تاثیر اور افادیت کو ہمیں مان لینا چاہیے۔

میرے جن دوست نے یہ سوال کیا ہے وہ ”صالح لٹریچر“ کے ذریعہ اصلاح پر بہت یقین رکھتے ہیں (مجھے بھی اس سے انکار نہیں ہے) لیکن وہ سوچیں، کیا کبھی اُن کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ اُن کے ”صالح لٹریچر“ کی اس تاثیر کے متعلق کوئی اشارہ کتاب و سنت میں موجود ہے؟ میرا خیال ہے کہ اُن کے دل میں کبھی بھی یہ سوال پیدا نہ ہوا ہوگا، کیونکہ وہ اپنے ذاتی علم و تجربے سے اور اپنے جیسے بہت سے لوگوں کے تجربے سے اس بارہ میں مطمئن ہیں۔ عجیب بات ہے کہ اپنی چیزوں اور اپنے تجربوں کے

(بقیہ حاشیہ ص ۵۵ سے)

جب تک حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحبت اور مجلس میں رہتے دل کی یہ کیفیت دیکھ کر ایک لمحے کیلئے

خلت نہ ہوتی اور غیب گویا سمجھ لیا کرتے۔ یہ کیفیت نہ ہوتی اور حضرت  
عبداللہ بن عباسؓ کے ساتھ حضور سے مروی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قبر میں دفن کر کے تم  
مٹی سے ہاتھ بھاڑے ہی تھے کہ ہیں اپنے قلوب بدلے ہوئے نظر آئے، یعنی حضور کے اس عالم سے  
عالم برزخ میں منتقل ہو جانے سے ہمارے قلوب کی حالت میں فرق محسوس پڑا۔ ان دونوں روایتوں سے  
صحبت کا ظہری کیفیات میں موثر ہونا صاف طور سے معلوم ہوتا ہے اور ذکر کی تاثیر کے لیے قرآن مجید کی  
آیت ”وَلَذَکَ لَکُمُ الْاٰکِبْر“ مرصع شاہد ہے، جس سیاق میں یہ آیت وارد ہے اس پر غور فرمایا جائے  
۱۳

ساتھ تو ہمارا طرز عمل یہ ہے، لیکن حضرت جنید بغدادی، سری سقسی، شیخ عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ شہاب الدین سہروردی، مجدد العارف ثانی شیخ احمد مرہندی، شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید جیسے ہزاروں بندگانِ خدا کا اجماعی و اتفاقی تجربہ ہمارے لیے موجبِ اطمینان نہیں۔

۳۔ ایک صاحب نے ذکر میں جہر اور ضرب سے اپنا سخت طبعی انقباض ظاہر کیا ہے اور یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ :

”اس میں ریاکاری کا شبہ ہوتا ہے اور آج کل کے اکثر سنجیدہ حضرات اس کو ریاکاری ہی سمجھتے ہیں“

جہری اور ضربی ذکر سے طبعی انقباض تو ایک ذوقی اور طبعی چیز ہے، اس لیے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی حاجت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طبیعتیں اور ان کے ذوق بہت مختلف بنائے ہیں، بعض طبیعتیں وہ بھی ہیں، جنہیں جہری اور ضربی ذکر سے ہی انس اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے مشائخِ محققین طبیعتوں کے درخ اور ان کی مناسبتوں کو دیکھ کر جہری یا ضربی ذکر، یا دوسرے اشغال ان کے لیے تجویز کرتے ہیں، لیکن ذکر بالجہر کے بارے میں ریاکاری کا جو شبہ ظاہر کیا گیا ہے یہ میرے نزدیک بالکل بے سوچے سمجھی بات ہے۔ اس زمانے میں جبکہ بقول انہی صاحب کے سنجیدہ آدمی ذکر بالجہر کو ریاکاری سمجھتے ہیں۔ اپنا اندازہ یہی ہے کہ کسی کو بالجہر ذکر کرتا دیکھ کر لوگ اس کے معتقد نہیں ہوتے، بلکہ بہت سے آدمی تو اس کو کم عقل یا کم کار اور ریاکار سمجھتے

ہیں۔ پس ایسی حالت میں جہری ذکر میں ریاکاری کا امکان فی زمانہ بہت کم ہے۔ بلکہ اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ آج کل سے ماحول میں ذکر بالجہر اکثر ریا شکنی کا ذریعہ ہو جاتا ہے اور دفعِ خطرات و وساوس میں ذکر بالجہر کی تاثیر اہل تجربہ کے نزدیک بالکل مُسَلَّم ہے۔

اس سلسلہ میں اتنی بات یہاں اور قابلِ ذکر ہے کہ ذکر میں جہر اور ضرب کے جو طریقے تصوف کے بعض سلاسل میں معمول ہیں۔ فنِ طب اور علمِ النفس کی روشنی میں اُن کی افادیت اور تاثیر بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہ عاجز تو تصوف کے اکثر اشغال کے متعلق یہی سمجھتا ہے کہ بعض کیفیات اور تاثرات اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے یہ سب ایک طرح کی طٹی اور نفسیاتی تدبیریں ہیں۔

اور اس لیے ان کو اہمیت و بنیاد نہ صرف یہ کہ غیر صحیح ہے بلکہ اصل مقصد کیلئے مضر بھی ہے، پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ان چیزوں میں ہر راہرو کا ادراک یکساں ہی ہو، بلکہ بعض اکابر سے سنا کہ اللہ کے بہت سے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو سلوک کی راہ میں اللہ تعالیٰ کی غنایت و توفیق سے بہت تیزی سے ترقی کرتے ہیں اور سلوک و تصوف کا جو اصل مقصد ہے وہ اُن کو بفضلہ تعالیٰ نصیب ہو جاتا اور آخر تک اُنہیں کسی لطیف اور کسی مقام کا بھی ادراک اور احساس نہیں ہوتا۔

اس عاجز کو اس دور کے جن اکابر سلوک سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ اُن سب کو اس پر متفق پایا کہ خاص کر اس زمانے کے لیے یہی اجمالی سلوک زیادہ مناسب ہے، اور

عقین نے تفریح فرمائی ہے کہ صحابہ کرامؓ کا سلوک بھی اجمالی ہی تھا۔

۵۔ ایک صاحب نے فرمایا :-

”ہم بہت سے آدمیوں کو دیکھتے ہیں کہ برسوں خانقاہوں میں رہنے اور وہاں ذکر شغل کرنے کے باوجود ان میں وہ چیزیں پیدا نہیں ہوتیں جن کے لیے تقویٰ اور خانقاہیت کی ضرورت بتلائی جاتی ہے“

بلاشبہ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن انصاف فرمایا جائے یہ حال اب صرف خانقاہوں ہی کا نہیں ہے، بلکہ ہمارے دینی مدرسوں اور دوسرے تمام دینی و اصلاحی سلسلوں کا حال بھی اس وقت یہی ہے کہ سینکڑوں میں دس بیس مشکل سے نکلے ہیں، تو کیا ان سب کو غلط اور فضول قرار دے کر ایک دم ختم کر دینا صحیح طریقہ عمل ہو سکتا ہے۔ صحیح طریقہ کار ان حالات میں یہ ہے کہ ہر سلسلہ اور ہر ادارہ کو زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کی ہر ممکن کوشش اور تدبیر کی جائے اور اس میں کوئی دقیقہ اٹھانا نہ رکھا جائے۔ لیکن نتائج میں کمی اور نقص دیکھ کر اس کو ہرے سے ختم کر دینے اور فضول قرار دینے کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ جن ناسازگار حالات میں اور جس انتہائی درجہ کے فاسد اور سخت مادہ پرستانہ ماحول میں ہمارے ان دینی اداروں کو کام کرنا پڑ رہا ہے ان میں دس پانچ فیصدی کامیابی بھی ہرگز ناکامی نہیں ہے۔

۶۔ ایک صاحب نے فرمایا :-  
 ”صوفیوں کے طرزِ عمل سے جو کچھ ہم نے سمجھا ہے وہ تو یہ ہے کہ  
 تقوٰتِ دراصل ”رہبانیت“ اور گوشہ نشینی کا نام ہے اور اسکی تائید  
 کرنا دراصل اسلام میں رہبانیت کو داخل کرنا ہے۔“

میرے نزدیک یہ بھی اُن ہی باتوں میں سے ہے جو اس سلسلہ میں بے سوچے  
 سمجھے کی جاتی ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں دراصل  
 عود اُن کے دل میں تقوٰت کے ایک غلط معنی بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ اپنی اسی  
 غلط فہمی کی بنا پر صوفیوں کو صرف اُن ہی لوگوں کو سمجھتے ہیں جو رہبانیت پسند اور  
 گوشہ گیر ہیں اور پھر اپنے اسی تصور کی بنیاد پر وہ یہ کہتے ہیں کہ تقوٰتِ رہبانیت  
 کا نام ہے اور ہر صوفی ”راہب“ ہی ہوتا ہے۔

اگر یہ حضرات خود اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے اور تقوٰت کے لیے رہبانیت  
 اور گوشہ گیری کو ضروری نہ سمجھتے، تو اس دور میں بھی ایسے بہت سے بندگانِ خدا  
 دیکھ سکتے تھے جو بجز اللہ سے صوفی بھی ہیں اور مردِ میدان بھی۔ مگر بات وہی ہے کہ جو گوشہ گیر  
 نہ ہو، یہ بے چارے اپنی کم نگاہی سے اُس کو صوفی مان ہی نہیں سکتے۔ اس کا علاج تو  
 خود اپنے علم اور تصور کی تصحیح سے ہی ہو سکتا ہے۔

۷۔ مقالہ کے ابتدائی حصے میں جن بزرگ کی خدمت میں حاضری اور تقوٰت کے  
 متعلق اُن سے اپنی گھٹکی کا اس عاجز نے ذکر کیا ہے۔ بعض حضرات کا شدید اصرار ہے  
 کہ ان کا اسم گرامی ظاہر کیا جائے، اس لیے عرض کرتا ہوں کہ میرے وہ محسن اور خادم

بزرگ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری مدظلہ ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ ناچیز صرف اُس تقویٰ کا  
**آخری بات :-** قائل اور حامی ہے جس کا ذکر اس میں کیا گیا ہے اور یہی اہل  
 حق کا تقویٰ ہے۔ باقی اس نام سے سینکڑوں خانقاہوں میں شرک و بدعت کا  
 جو کالہ و بار ہوتا ہے، اللہ نے اپنے جس بندے کو بھی ایمانی بصیرت کا کوئی ذرہ  
 نصیب فرمایا ہو وہ یقیناً اُس سے بے زاہد ہوگا۔



(۴)

# تصوّف اور اُس کے اعمال و

اشغال کے متعلق بعض شکوک و شبہات کا جواب !

از جناب مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تصوّف اور اُس کے اعمال و اشغال کے متعلق جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں، ان کی حسب ذیل دو بڑی قسمیں کی جا سکتی ہیں :-

۱۔ پہلی قسم ان شکوک و شبہات کی ہے جو رسمی خانقاہوں اور رسمی سجادہ نشینوں کو دیکھ کر یا ان کے مہفوات سن کر پیدا ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ جس شخص کو کتاب و سنت کا ادنیٰ واقفیت بھی ہے وہ معمولی غور و فکر کے بعد سمجھ لے گا کہ یہ سب فریب ہے۔ اور حقیقت اس سے بہت دُور ہے۔

۲۔ دوسری قسم ان شکوک و شبہات کی ہے جو علمی طور پر پیش آتے ہیں، اس قسم کے شبہات زیادہ تر ان لوگوں کے دماغوں میں پیدا ہوتے ہیں جن کو نہ محققین صوفیہ کی

کتا ہیں پڑھنے کا موقع ملا ہے اور نہ اپنے زمانہ کے محققین سے سابقہ پڑا ہو۔ یہ سب سمجھتے ہیں کہ تصوف فلسفہ اشراق، جدید افلاطونی الہیات اور ہندو جوگ سے ماخوذ ہے حالانکہ امر واقعہ یہ نہیں ہے۔

فلسفہ اشراق اور ہندو جوگ میں چند ریاضتوں اور مجاہدوں کے سوا کیا ہے؟ وہ انہیں مجاہدوں اور محنتوں کو مقصود حقیقی جانتے ہیں اور اس کے برعکس ہمارے صوفیہ صافیہ ان ریاضتوں اور مجاہدوں کو جن کے ساتھ اتباع شریعت نہ ہو کوئی وقعت نہیں دیتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی ارشاد فرماتے ہیں :-

»وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو تقلید سنت سے الگ ہو کر اختیار کئے جائیں، معتبر نہیں ہیں، اس لیے کہ جوگی اور ہندوستان کے براہمہ اور یونان کے فلاسفہ بھی ان کو اختیار کرتے ہیں اور یہ ریاضتیں ان کی گمراہی میں امانہ کے سوا اور کچھ نہیں کرتی ہیں۔«

(جلد اول مکتوب دہرہ و بست ویم)

مرشد العرب والعمم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے ایک کرامت نامہ کے چند الفاظ غور سے سننے کے قابل ہیں :-

»اور بعض جملاء جو کہ دیتے ہیں کہ شریعت اور ہے اور طریقت اور ہے، محض ان کی کم فہمی ہے، طریقت بے شریعت خدا کے گھر مقبول نہیں، صفائی قلب کفار کو بھی حاصل ہوتی ہے۔ قلب کا حال مثل آئینہ کے ہے، آئینہ زنگ آلودہ ہے تو پیشاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے اور گلاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے،



لیکن فرق بجااست اور طہارت کا ہے۔ ولی اللہ کو پہچاننے کے لیے اتباع سنت کوٹی ہے، جو طبع سنت ہے وہ اللہ کا دوست ہے اور اگر مبتدع ہے تو محض بے ہودہ ہے، فرق عادات تو دجال سے بھی ہوں گے“

(ردحجوز المذنبین ص ۱۲۹)

تصوف کی مشہور و متداول کتابیں سامنے رکھئے :- مثلاً کتاب اللمع، تعرف رسالہ قشیریہ، عوارف، فتوح الغیب، احیاء العلوم، مدارج السالکین، ان کتابوں کے صرف ابواب پر نظر ڈال لیجئے۔ اور فیصلہ کیجئے کہ ان کتابوں میں توحید اور اس کے احوال، اتباع سنت، عبادات کی نشوونما و خصوصیات کے ساتھ ادائیگی، معاملات کی صفائی اور تصفیہ اخلاق کے سوا کیا ہے؟

بے شبہ تصوف کی بعض کتابوں میں کچھ ایسے مضامین بھی آگئے ہیں جن سے بعض طبائع کو وحشت ہو سکتی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ مضامین تصوف کے اصول و مقاصد سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ اگر کسی کی فہم ان کو نہیں قبول کرتی ہے تو ان کو چھوڑ دے، اسی طرح اگر خلاف شریعت کوئی بات نظر آئے، تو ان کی وہی حیثیت سمجھئے جو کتب تفسیر میں اسرائیلیات، یا کتب احادیث میں موضوعات کی ہے۔ اب اسرائیلیات یا موضوعات کی وجہ سے کتب تفسیر و احادیث سے تو قطع نظر نہیں کی جاسکتی ہے۔ جس طرح محققین کتب تفسیر و حدیث میں اغلاط کی تصحیح کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح محققین صوفیہ بھی اپنے فن میں صحیح کو سقیم سے اور درست کو غلط سے الگ کرتے رہے ہیں،

کوئی وسیع النظر اس سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔

مثال کے طور پر مولانا اسماعیل شہید کی ”صراط مستقیم“ ہی کو دیکھئے کہ اُس میں اسی قسم کی بدعات پر متنبہ کرنے کے لیے پورا ایک باب موجود ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات جلد سوم میں شیخ روز بہان نقلی کی کتاب ”تبیین غلطات المتصوف“ کا ذکر موجود ہے جو اسی عنوان پر ہے۔

(مکتوب ہشاد و نہم)

تصوف اور اُس کے اعمال و اشغال کے متعلق شکوک و شبہات کے حل کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خود محققین صوفیہ سے تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کی حقیقت اور مقصد کو سُن لیا جائے اور پھر غور کیا جائے کہ شریعت تصوف کے مقصد سے کیا کچھ سوا چاہتی ہے؟ اور کیا تصوف شریعت پر اخلاص کے ساتھ عمل کے سوا اور کوئی چیز ہے؟

تصوف کی مستند اور مشہور کتاب احیاء العلوم کی شرح اربعۃ السادات المتعین

میں ہے :-

”وہیں تصوف کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ ریاضتوں اور

مجاہدوں سے علم و یقین تک پہنچا جائے“ (صفحہ ۳۹)

حضرت مجدد الف ثانی ”ملاحاجی محمد لاہوری کو تحریر فرماتے ہیں :-

”شریعت کے تین حصے ہیں :- علم، عمل، اخلاص، جب تک یہ تینوں

اجزاء متحقق نہ ہوں، شریعت متحقق نہیں ہوتی ہے۔ جب شریعت

متحقق ہو جاتی ہے، حتیٰ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے جو کہ تمام

دنیاوی اور اخروی سعادتوں سے بالاتر ہے۔ طریقت و حقیقت جس سے کہ صوفیہ ممتاز ہوئے ہیں۔ دونوں (شریعت کے تیسرے حصے) یعنی اخلاص کی تکمیل میں شریعت کے خادم ہیں۔ پس ان دونوں (یعنی طریقت و حقیقت) کی تحصیل صرف شریعت کی تکمیل کے لیے کی جاتی ہے۔ احوال و مواجید اور علوم و معارف جو اثناءِ راہ میں حاصل ہوتے ہیں وہ مقاصد میں سے نہیں ہیں۔ ان سب سے گزر کر مقامِ رضا تک پہنچنا چاہیے جو کہ سلوک کا آخری مقام ہے۔ اس لیے طریقت و حقیقت کی منزلوں کو طے کرنے کا مقصد تحصیلِ اخلاص کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اخلاص ہی سے مقامِ رضا حاصل ہوتا ہے، کوتاہ اندیش احوال و مواجید کو مقصود اور مشاہدات و تجلیات کو مطلوب جانتے ہیں اور کمالاتِ شریعت سے محروم ہیں۔ بے شبہ مقامِ اخلاص کا حصول اور مرتبہِ رضا تک وصول ان احوال و مواجید کو طے کرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی حیثیت مقصودِ حقیقی کے معاون کی ہے۔ یہ بات اس فقیر پر بہ صدقہٴ حبیبِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) اس راہ میں دس برس گزارنے کے بعد واضح ہوتی ہے۔

(جلد اول مکتوبہ و ششم)

مکتوبہ چہلم میں صراحت سے ارشاد فرماتے ہیں :-

و مخدومنا! منازلِ سلوک طے کرنے اور مقاماتِ جذب قطع کرنے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ اس سیر و سلوک کا مقصد

مقامِ اخلاص کی تحصیل ہے“ (جلد اول)

مقصود دوسروں سے مفتی (جلد اول) میں ارشاد ہے :-

”طریقِ صوفیہ کے سلوک کا مقصد صرف یہ ہے کہ معتقداتِ شرعیہ

کا یقین بڑھے، نیز احکامِ فقہیہ کے ادا میں آسانی ہو“

”انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ“ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

فرماتے ہیں :-

”اور مقصود صوفیہ کے طریقہ علیہ کا مشاہدہ حق کا حصول ہے -

”کانک تراخ“ اور اس حضور کا نام انہوں نے مشاہدہ

بالقلب رکھا ہے“ (ص ۳۹)

”القول الجمیل“ میں ہے :-

”مشائخ کے تمام طریقوں کا مرجع یہ ہے کہ ایک ہیئت نفسانیہ

حاصل ہو جائے، جس کو وہ نسبت کہتے ہیں، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ

کے ساتھ ارتباط و انتساب ہے اور اس کو سکینہ اور نور

بھی کہتے ہیں“

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :-

”جب بندہ طاعات، طہارات اور اذکار پر مداومت کرتا ہے

تو نفسِ ناطقہ میں ایک صفت قائم ہو جاتی ہے اور اس توجہ کا

ملکہ راسخ پیدا ہو جاتا ہے“

(القول الجمیل)

حضرت شاہ مولانا اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ "صراطِ مستقیم" میں تحریر فرماتے ہیں :-

”جاننا چاہیے کہ اولیاء اللہ کے ہر طریقہ میں مجاہدات، دیاضات اذکار، اشغال اور مراقبات مقرر ہیں۔ ان امور میں سے ہر ایک طالب کے اندر ایک اثر پیدا کرتا ہے، جس کے سبب سے طالب کو عالمِ قدس سے ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی کو صوفیہ کی اصطلاح میں نسبت کہتے ہیں“

(ص ۱۶۵)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی جامع کلمات، ہستی ابھی قریبی زمانے میں گزری ہے۔ ان کے ارشاداتِ عالیہ بھی سن لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں :-

”پہن، ہستی مطلق کو ہر دم خیال میں پرورش کرنا اور بلا کیف حاضر و موجود جان کر حیا و شرم کے ساتھ بندہ (کا) مطیع رہنا مقصدِ اصلی ہے اور یہی احسان ہے باقی زوائد“

(مکاتیب رشیدیہ ص ۲۱)

”سنو کہ سلوک صحابہ و تابعین میں تحصیل احسان اور اپنا بندہ ناچیز بے اختیار ہونا اور من کل الوجہ کا محتاج ذاتِ غنی کا اور حضور اس کو دگار بے نیاز محسن عباد کا ہوتا تھا، بندگی در بندگی، عجز در عجز، توکل در توکل، ہمت اطاعت و جان و مال بڑی فی و فی اللہ لہی اس کا ثمرہ تھا“

(ص ۲۰)

» اصل الامول اور اصل مقصود و مامور سلوک صحابہ کرامؓ ہے۔ اس میں بحث بندگی سے اور ایمان بالغیب کے کا شاہد ہو جانے سے اور حُسنِ اخلاق سے ہے۔“

(ص ۳۲)

» مقصدِ جملہ اشغالات و مطلب و نتیجی جملہ مراقبات کا وہ حضورِ قلب بے کیفیت ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو نصیب فرمایا، نسبت صحابہ کرامؓ یہ ہی حضور تھا۔“

(ص ۴۵)

» برابر! یہ تمام شریعت کا علم اور طریقت کا طریقہ نورِ یقین کی تحصیل کے واسطے ہے اور انجام و منتہی سب کا یہی تو ہے کہ جس کو مسلمان سرسری طور سے علم رکھتے ہیں۔ وہ یقین حق یقین، مثل مشاہدہ کے ہو جائے، یہ انتہا سب طُرق کی ہے۔“

(ص ۸)

» دوسرے وہ کیفیت کہ اپنے آپ کو روبرو مالکِ معبود کے جانے، اور شرم و حیا طاری ہو جائے، اس کا نام حضور اور یادداشت ہے، اس کو لسانِ شرع میں احسان کہتے ہیں اور یہی نسبتِ معتبرہ ہے کہ مسلسل چلی آتی ہے۔“

(ص ۹۵)

سطور بالا میں محققین موفیہ کے چند اشارات پیش کئے گئے ہیں، ورنہ اس مفہوم کے دفتر کے دفتر تیار ہو سکتے ہیں۔ بہر حال یہ چیز تو ظاہر ہو گئی کہ تصوف تحصیلِ اخلاص و یقین کے سوا اور دوسری کوئی چیز نہیں ہے اور اخلاص و یقین کے مطالبہ سے قرآن مجید اور احادیثِ نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دفاتر بھرے پڑے ہیں۔

اب تقویٰ کے اعمال و اشغال یعنی اس اخلاص و یقین کی تحصیل کے ذرائع و وسائل کا مسئلہ باقی رہا، تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فیضِ صحبت کی وجہ سے ان وسائل و ذرائع کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی جو بعد کے لوگوں کو پیش آئی۔ وہاں نبوت کا آفتابِ عالم تاب موجود تھا، وہ شمع و فانوس کی فکر میں کیوں پڑتے؟

حضرت مجددؑ نے خوب ارشاد فرمایا :-

» بدن کے قرب کا دلوں کے قرب پر بڑا اثر پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی ولی صحابی کے مرتبے کو نہیں پہنچتا ہے «  
(مکتوبات جلد اول ص ۲۵)

حضرت قاضی شامہ اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ارشاد الطالبین میں ارشاد فرماتے ہیں :-

» اس بات پر اجماع ہے کہ صحابہؓ غیر صحابہ سے افضل ہیں، حالانکہ علم و عمل میں صحابہؓ اور غیر صحابہؓ مشارکت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود

یعنی جن صحابہؓ و اعمال کے مخاطب و مکلف صحابہؓ تھے، انہی کے مخاطب و مکلف ہم بھی ہیں ایسا نہیں ہے کہ ان کے لیے دوسرے اعمال و عقائد تھے اور ہمارے لیے دوسرے، نیز دین کی جن حقیقتوں کا علم ان کو تھا، بعد والوں کو بھی ان کا علم ہوا اور نماز، روزہ وغیرہ جو عمل وہ کرتے تھے، بعد والوں نے بھی وہ کئے۔ ۱۲

حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے کہ صحابہؓ نے راہِ خدا تعالیٰ میں جو نصف صاع جو خرچ فرمایا ہے اگر دوسرا اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو دونوں برابر نہیں۔ یہ فرق ان باطنی کمالات کی بناء پر ہے جو ان کو حضرت رسول کریم ﷺ کے فیضِ مُجْت سے حاصل ہوئے تھے۔“

(ص ۴)

حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فیضِ مُجْت کے سوا حضراتِ صحابہؓ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اور دوسرے طریقوں سے بھی اس نورِ اخلاص و یقین کو حاصل فرماتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ ”القول الجمیل“ میں فرماتے ہیں :-  
 ”میرا گمانِ غالب ہے کہ صحابہؓ کرام نسبت کو اور طریقوں سے بھی حاصل فرماتے تھے۔ مثلاً نماز و تسبیحات پر ان کے شرائط کے ساتھ مواظبت، طہارت اور یادِ موت اور عذاب و ثواب کے خیال پر ملامت؛ ان چیزوں سے مادی لذتوں سے بے تعلق پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ حضرات قرآن کی تلاوت اس میں تدبیر، وعظ اور زہد و رقاق کی احادیث کے سننے پر مواظبت فرماتے تھے اور اُس سے اُن کو ایک ملکہِ راسخہ اور سہلیتِ نفسانیہ حاصل ہوتی تھی۔“  
 (القول الجمیل)



اس سلسلے میں ایک اہم معاملہ کی طرف بھی اشارہ کرنا ہے جس پر حضرت مجدد صاحب اور مولانا اسماعیل صاحب شہیدؒ نے متنبہ فرمایا ہے، اس کی تشریح و تفصیل کا موقع نہیں ہے، تاہم ممکن ہے کہ اہل ذوق اس سے مطمئن ہوں۔ حضرت مجدد صاحب سے دریافت کیا گیا کہ :-

» فنا فی اللہ اور بقا باللہ اور جذب و سلوک کے تمام مقامات کے طے کرنے کے بعد جو قرب الہی حاصل ہوتا ہے، حضرات صحابہ کرامؓ جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک صحبت کی بنا پر تمام اولیائے امت سے افضل قرار پائے۔ کیا ان کو محض اسلام قبول کرنے سے یہ سیر و سلوک فی حق صحبت سے حاصل ہو گیا تھا؟ ان حضرات کو علم جذب و سلوک حاصل تھا، یا نہیں؟ اگر حاصل تھا تو اُس کا کیا نام تھا؟ اور اگر نہیں حاصل تھا، تو کیا اُس کو بدعت حسد کہہ سکتے ہیں؟

اب مجدد صاحب کا جواب سنئے :-

» اس اشکال کا حل صحبت سے تعلق رکھتا ہے، وہ بات جو اس مدت میں کسی نے نہیں کہی۔ ایک مرتبہ لکھنے سے کیسے سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن جب دریافت کیا گیا تو اب جواب سے چارہ نہیں۔ اس لیے مختصر طور سے لکھا جاتا ہے :-

وہ قرب خداوندی میں کا تعلق فنا و بقا اور سلوک و جذب سے ہے، قرب ولایت ہے، اولیائے امت اس سے مشرف ہوئے ہیں،

اور جو قرب کہ صحابہ کرامؓ کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحبت میں حاصل ہوا وہ قربِ نبوت ہے، اس قرب میں نہ فنا ہے نہ بقاء نہ جذب ہے نہ سلوک اور یہ قرب قربِ ولایت سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس لیے کہ یہ قرب حقیقی ہے اور وہ قرب ظلی ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے، مگر ہر شخص کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی ہے، خواص بھی اس موقع پر عوام کے مشابہ ہیں۔

گر بوعلی نوائے قلندر نواختے ؛  
صوفی بد سے ہر آنکھ بہ عالم قلندر راست

کمالِ قربِ نبوت اگر قربِ ولایت کے راستے سے طے ہوتے ہیں تو فنا و بقاء اور جذب و سلوک سے چارہ نہیں اور اگر اس راستے سے کمالِ قربِ نبوت نہ حاصل کئے جائیں، تو فنا و بقاء اور جذب و سلوک کی ضرورت نہیں ہے؛ صحابہ کرامؓ نے قربِ نبوت کے راستے سے منزل طے کی ہے۔ جذب و سلوک اور فنا و بقاء سے ان کو کام نہ تھا۔“

(مکتوبات جلد اول مکتوبہ صد و سیزدہم)

حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ ”صراطِ مستقیم“ میں ارشاد فرماتے ہیں :-

”ایک باریک نکتہ جس سے اہل زمانہ ناواقف ہیں حبِ نفسانی اور حبِ عقلی کے درمیان تمیز کرتا ہے، حبِ نفسانی مبادی سلوک کے

داردات میں سے ہے اور حُبِّ عقلی کمالات انبیاء کرام اور مقاماتِ اولیاء عظام میں سے ہے۔ اکثر عوام موفیہ نے حُبِّ نفسانی کو حُبِّ عقلی کی جگہ دے رکھی ہے اور اس کو اشاراتِ شریعیہ کا مشابہت الیہ جانتے ہوئے حضراتِ انبیاء و اولیاء کے سلوک کو اہلِ عشق و مواجد کے احوال سے تطبیق دینا چاہتے ہیں اور لا حاصل تشویشات میں پڑتے ہیں۔“

(ص ۴)

اصل مقصود یہی سلوکِ راہِ نبوت ہے، مگر چونکہ سلوکِ راہِ ولایت سے سلوکِ راہِ نبوت آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے سلوکِ راہِ ولایت کو اختیار کیا جاتا ہے۔ حضرت شہیدؒ فرماتے ہیں:-

”دھول نسبتِ ولایتِ سلوکِ راہِ نبوت کو آسان کر دیتا ہے۔“

اور جس کو نسبتِ ولایت حاصل ہوتی ہے وہ نسبتِ نبوت کو تھوڑی

محنت میں حاصل کر لیتا ہے۔“

(”صراطِ مستقیم“ ص ۵)

اب تقویٰ کے اُن اعمال و اشغال کا مسئلہ باقی رہا، جن کی ضرورت عہدِ نبوت سے دُوری اور ماحول کی ناسازگاری کے باعث متاخرین کو پیش آئی۔ اس سلسلہ

لہ حُبِّ نفسانی کا تعلق سلوکِ راہِ ولایت سے اور حُبِّ عقلی کا تعلق سلوکِ راہِ نبوت سے ہے،

جیسا کہ صراطِ مستقیم میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ - ۱۳

میں اصولی بات یہ ہے کہ ان اعمال و اشغال میں ذکر و فکر یہ دو چیزیں بنیادی ہیں اور یہ دونوں چیزیں مامورات شرعیہ میں سے ہیں۔ بحث جو کچھ ہے وہ ذکر و فکر کے طریقوں، وضعوں اور قیود میں ہے۔ اتنا خوب سمجھ لیجئے کہ ذکر و فکر کے یہ قیود، طرق اور اوضاع صرف تدبیر و معالجہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ”ایضاح الحق المرشح“ میں مولانا اسماعیل صاحب شہید<sup>۲</sup> فرماتے ہیں :-

”صوفیہ کے نفع بخش اشغال کی حیثیت دوا و معالجہ کی ہے کہ بہ وقت ضرورت ان سے کام لے اور بعد کو پھر اپنے کام میں مشغول ہو۔“

(ص ۷)

معالجہ کے یہ طریقے حالات کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ ”صراط مستقیم“

میں ہے :-

”بہر وقت اور ہر قرن کے اشغال جدا ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر طریقے کے محققین تجدیداً اشغال کی کوشش فرماتے رہتے ہیں۔“ (ص ۷)

اسی لیے محققین نے تصریح فرمادی ہے کہ :-

”یہ ہرگز خیال نہ کرنا کہ نسبت بجز ان اشغال کے اور کسی طرح حاصل نہیں ہوتی ہے۔“

(القول الجمیل)

بلکہ اگر ان طرق و اوضاع اور اعمال و اشغال کو کوئی مقصود جانتا ہے، تو یہ حضرات اس پر سخت انکار فرماتے ہیں۔ ”ایضاح الحق المرشح“ میں ارشاد ہے :-

درد و ظائف و اذکار، ریاضات، غلوت، چلہ کو مقرر کرنا، ذکر  
بہری اور ذکر ضمنی کی وضعوں کو مقرر کرنا، مزب عدد اور مراقبہ برزخیہ  
کا مقرر کرنا، اگر طالب ان سب کو اصل کمال شرعی یا کمالات میں  
سے جانتا ہے تو یہ سب بدعتِ حقیقیہ ہیں، لیکن خواص جو اس کو صرف  
وسائل و ذرائع جان کر رواج دیتے ہیں، اُن کے حق میں بدعتِ حکمیہ  
ہیں، اور انھیں الخواص جو ان چیزوں سے بہ وقتِ ضرورت کام  
لیتے ہیں اور پھر کام نکلنے کے بعد چھڑا دیتے ہیں اُن کے حق میں یہ  
بدعت نہیں ہے“

(۳۷)

محققین مؤید ان اشغال و اعمال سے کس طرح کام لیتے ہیں اور پھر کس  
طرح ان سے الگ کر کے اصل مقصود میں لگا دیتے ہیں۔ اس کو جاننے کے لیے  
صرف مکاتیبِ رشیدیہ میں سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے چند ارشادات  
نقل کئے جاتے ہیں :-

”ذکر کے نذر کا ملاحظہ جو ابتداء میں تلقین ہوتا ہے، وہ مقصدِ اصلی  
نہیں بلکہ تمہید ہوتا ہے“

(۱۵)

”پاسِ انفاس وغیرہ سب خیالِ اس کے ہیں کہ ذکرِ مخیلہ میں قائم ہو  
جائے ورنہ اصل مقصود نہیں، جب خیالِ ذکرِ ذاتِ قائم ہو جائے تو  
زبان اور انفاس کسی کی ضرورت نہیں“

(۱۶)

» ذکرِ جہری کی اب کچھ حاجت نہیں، ذکرِ اصل میں تذکرِ قلب ہے سو جب  
ذکرِ قلبی حاصل ہوا، اب زبان کی کچھ ضرورت نہیں ۱۷

(ص ۱۷)

» سب اذکار و مراقبات تحصیل نسبت کے واسطے ہیں، جب نسبت  
یادداشت حاصل ہو چکی اب مراقبات کی درخواست عجیب بات  
ہے، اب تمہارا سب ذکر لسانی، قرآن و صلوة و ذکرِ مسنون  
مراقبہ ہے، سب میں یادداشت ہے کہ ثمرہ مراقبت یہی ہے، اب  
کسی مراقبہ کی حاجت نہیں، اذکارِ مسنونہ پڑھو، قرآن و نوافل صلوات  
مسنونہ ادا کرو اور بس ۱۸ (ص ۱۸)

» ضرورتِ تعینِ شغل کی بلندی کے واسطے ہوتی ہے، ہفتی اپنے اختیار

۱۷ مطلب یہ ہے کہ قلب میں اللہ کے ذکر اور یاد کی کیفیت کو راسخ اور مستقل کرنے کے لیے جو جہری ذکر  
سائلین کو کرایا جاتا ہے، جب اللہ تعالیٰ وہ کیفیت پیدا فرمائی۔ اور روح حاصل ہو جائے تو  
پھر اس کے جاری رکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ قلب میں اس کیفیت کے پیدا ہوجانے  
کے بعد ذکر باللسان کیا ہی نہ جائے۔ ذکر جو خود مقصود اور ما مجہب ہے وہ تو تادم آخروا کی رہتا  
ہے۔ حدیثِ نبوی میں ہے :- لایزال لسانک رطباً حن ذکواللہ (مکتبہ رشیدیہ کے)  
انگلے اقتباس سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے۔ ۱۸

میں ہوتا ہے، جس امر سے مطلب برآمد ہو وہی کرے، نہ اُس کو  
 قید ذکرِ زبانی کی ہے، کوئی ذکر ہو، نہ کسی تصورِ خیال کی غرض کام  
 سے ہے“ (ص ۲۸)

”الحاصل اگرچہ یہ قوتِ تاثیر اور توجہ و کشف اور تصرفِ دنیا میں  
 بہت ہے، مگر یہ نورِ یقین مثلِ کیمیا کے نادر الوجود ہے۔ اگرچہ عالم  
 خالی نہیں، اشغالِ سب اس کے مقدمات تھے، اب خود مقصود ہو گئے  
 اے کاشکہ اس یقین کا شاخِ ثبہ ہوا بھی اس محروم کو لگ جائے کہ سارا  
 مدار اس پر ہی ہے، اس نسبت کا نام نسبتِ احسان ہے کہ بعثتِ  
 جنابِ فخرِ رسل (علیہ السلام) کی اس کے ہی واسطے تھی اور صحابہ جملہ  
 اسی نسبت کے حامل تھے۔ علیٰ حسبِ مراتب پھر اولیائے امت نے  
 دوسرے طریقے سے پیدا کیا کہ ہر ایک نے اشغالِ اپنے اپنے طریقے  
 کے وضع کئے، سو یہ سب مقدمات اس کے ہیں اور بس! اس کا  
 کوئی طریقِ معین نہیں، ہر شخص کا طرزِ جداگانہ ہے“ (ص ۲۸)

تقویٰ کا مقصد اور اس کے اعمال و اشغال کی حقیقت کے واضح ہو جانے  
 کے بعد عرض ہے کہ اگر کوئی خوش نصیب ایسا ہے کہ اس کو کوئی راضیت و مجاہدہ  
 کے بغیر اخصاص و احسان کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے تو وہ بہت ہی مبارک بات اور نہ  
 قاعدہ یہ ہے کہ آدمی کو جس چیز سے خود نفع ہوتا ہے اسی کو وہ دوسروں کو بتلانا

ہے۔ اہل اللہ کی بڑی جماعت (جن کے صدق و اخلاص پر سب کو اتفاق ہے) خبر دیتی ہے کہ ذکر و فکر ہی کی راہ سے اُن کو اخلاص و یقین کی دولت حاصل ہوئی ہے

من نہ تنہا دریں مینخانہ مستم!  
جنید و شبلی و عطار ہم مست

اس لیے: اگر کسی کو ان کیفیات مطلوبہ کی ضرورت و تلاش ہے تو وہ اس راہ کو اختیار کرے

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد

اے خواجہ درویش و گرنہ طبیب مست

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ یہ راہ بحث و نظر کی نہیں، بلکہ جدوجہد اور عمل کی ہے۔ راقم سطور نے کئی برس ہوتے ایک جلیل القدر شیخ وقت (جو بحمد اللہ ابھی اپنے فیوض و برکات کے ساتھ موجود ہیں) کی خدمت میں عرض کیا کہ :-

”تعوف پر پڑھنے کے لیے کوئی کتاب تجویز فرمادی جائے“

جواب میں ارشاد فرمایا کہ :-

”وہ راہ مطالعہ سے نہیں، بلکہ مجاہدہ سے طے ہوتی ہے“

پھر ارشاد فرمایا کہ :-

”اگر پڑھنا ہی ہے تو شاہ اسماعیل شہید صاحب کی ”صراط مستقیم“ پڑھیے۔

بہر حال گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اگر دل میں جستجو ہے تو کسی صاحب کمال کے

مشورہ سے کچھ کیجئے۔



قال راہ گزار و مرد حال شو!  
 پیش مردے کا طے پامال شو!  
 کسی اور مقصد سے نہیں، تو تجربہ کر کے دیکھئے۔ اگر کسی صاحبِ کمال کی صحبت،  
 یا اُس کے بتلائے ہوئے طریقے پر عمل کرنے سے حق تعالیٰ کا تعلق بڑھتا ہوا  
 محسوس ہو، ایمان میں تازگی کے آثار پائے جائیں تو فیہا، ورنہ جہاں زندگی میں  
 اچھے اور بُرے بہت تجربے ہوتے ہیں۔ اس کو بھی ایک ناکام تجربہ سمجھ کر  
 چھوڑ دیجئے گا۔

اے بے خبر بکوش کہ صاحبِ خبر شوی  
 تاراہ میں نہ باشی کے راہ بر شوی  
 در مکتبِ محقق پیش ادیب عشق  
 ہاں اے سپر بکوش کہ روزے پد شوی



(۵)

## یقین اور اُس کے ثمرات

(از جناب مولانا محمد ادریس صاحب ندوی نگر اہی)

تقوت کے بارے میں پیدا ہونے والے بعض شکوک و شبہات سے متعلق جو مضمون مختصر سا گذشتہ صفحات میں ناظرین کرام نے ملاحظہ فرمایا، اُس میں ایک جگہ عرض کیا تھا :-

”تقوت کا اصل مقصد مرتبہ یقین کی تحصیل ہے۔“

اس یقین کی حقیقت کیا ہے؟ اس کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ حضرت شیخ

شہاب الدین سہروردیؒ ”عوارف“ میں ارشاد فرماتے ہیں :-

”بشری جمادات اٹھ جانے کے بعد دل میں جو نور حقیقت ظاہر ہوتا

ہے، اُس کا نام یقین ہے، جس سے ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے۔

اس سے وہ یقین مراد نہیں ہے جو محض دلائل سے ”اصل ہو“

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہؒ ”ازالۃ الخفاء“ میں

فرماتے ہیں :-

”یہاں یقین سے مراد وہ یقین خاص ہے جو بطریقِ موہبت صالحین اُمت کو لعیب ہوتا ہے، اس کو صوفیہ کی اصطلاح میں یادداشت کہتے ہیں، بلکہ وہ یقین جو استدلال یا تعلیم سے پیدا ہو“

(مقصد دوم ص ۱۴۲)

یہ یقین عبد اور محبوب کے رشتہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اسلامی زندگی کی جان ہے، جس طرح قالبِ روح کے بغیر اور اشکین بغیر لہر کے بے لطف ہیں، اسی طرح مرتبہ یقین کے بغیر اعمال بے کیف ہیں۔ صحیح روایت میں ہے کہ :-

”و اُمت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوا اور اُمتوں نے گویا فجر سے ظہر تک کام کیا۔ بعضوں نے ظہر سے عصر تک کام کیا اور اُمت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عصر سے مغرب تک کام کیا۔ لیکن اجر و ثواب اس اُمت کو اوروں کے مقابلے میں دوگنا دیا جائے گا“

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ :-

”یہ فرق قوتِ یقین ہی کی بنا پر ہے“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ :-

ملہ کتاب الایمان ص ۱۱۱ ملہ انصاری دہلی -

”مجھ کو پوری اُمت کے مقابلے میں وزن کیا گیا تو میرا پلہ بھاری رہا، پھر اس میں ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کو رکھا گیا تو وہ بھی بھاری رہے۔ ۳۱ کے بعد عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو تو لا گیا، تو وہ بھی سب سے وزنی ہے۔“

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ :-

”یہ سب قوتِ ایمانی کا کرشمہ ہے۔“

یہی وہ یقین ہے کہ جس کے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا کہ :-

”جب نور دل میں آتا ہے تو اس میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔“

صحابہ نے عرض کیا کہ :-

”یا رسول اللہ! اس کی نشانی کیا ہے؟“

ارشاد ہوا کہ

”آخرت کی رغبت، دُنیا سے نفرت، موت سے پہلے اس

کی تیاری۔“

اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات، ان کے وعدوں و وعیدوں کو کون نہیں جانتا اور

مانتا ہے، لیکن ان کا یقین ہم کو کہاں تک حاصل ہے، ہماری عملی زندگی

۱۱۔ کتاب الایمان ص ۱۱۰ - ۱۱۱

۱۲۔ مشکوٰۃ کتاب الرقاق - ۱۲

عُداس کی شاہد ہیں۔

ہم سب جانتے اور مانتے ہیں کہ حق تعالیٰ حاضر و ناظر ہیں، ہمارے ساتھ ہیں  
زاق ہیں، تمیخ و بعیر ہیں، رؤف و رحیم ہیں۔ شفاء انہی کے ہاتھ میں ہے، موت و  
حیات اور نفع و ضرر کے وہی مالک ہیں۔ الغرض تمام صفاتِ کمالیہ انہی کے لیے  
مخصوص ہیں۔ نیز یہ کہ طاعات اُن کی رضا اور معافی اُن کے غضب کا باعث ہیں۔  
لیکن اس جاننے اور ماننے سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر اگر ہم کو ان امور کا  
یقین کامل بھی حاصل ہو تو کیا عالم ہو اور ہماری زندگیوں میں کتنا بڑا  
انقلاب آجائے۔

کیا اپنی حاجات کو حق تعالیٰ کے سوا پھر ہم کسی اور کے سامنے بالاستقلال  
پیش کر سکتے ہیں؟ کسی معاملے میں ہمارے دلوں میں ان سے شکوہ پیدا ہو سکتا ہے۔  
رنج و راحت کے مواقع پر ہم حدود سے بڑھ سکتے ہیں؟ کیا ہم بالقصد ان کی طاعات  
کو چھوڑ سکتے ہیں اور گناہوں کے مرتکب ہو سکتے ہیں؟ ان سے ایک لمحہ بھی غفلت  
ہو سکتی ہے؟ اور کیا پھر خضوع و خشوع کے بغیر نمازیں ممکن ہیں؟ ان کی محبت کا احساس  
کیا ہم کو انہیں کا نہ بنا دے گا۔

اُمّ سحر اُن دلبرِ غوئیں جگر اُن

گفتارِ تو بر خاطر من بارگراں

شرمت بادا کہ من بہ سویت نگر اُن

باشم تو نہی چشم بہ روئے دگر اُن

یہ یقین جب دل میں راسخ ہو جاتا ہے تو احکامِ شرعیہ سے تعلق بڑھتا ہے،

رزائل دُوب جاتے ہیں اور فضائل کے چشمے اُبل پڑتے ہیں ۔

بلے ہر جا شود مہر آشکارا

سہارا جز نہاں بودن چہ یارا

حضرت خواجہ محمد معصوم ملانعمت الہی کو تحریر فرماتے ہیں :-

یہ نسبت عارف پر جب غالب ہو جائے گی تو اس کو احکام

شرعیہ سے زیادہ ربط ہو گا ۔

(مکتوبات ص ۲۲۴)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب "ازالۃ الخفاء" میں تقویٰ کی حقیقت بیان کرتے

ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کی تین اصل ہیں :-

۱۔ اصل اول :- اعمالِ خیر مثلاً نماز، روزہ، ذکر، تلاوت وغیرہ کے

دریغ سے یقین پیدا کرنا، یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ سب مسلمان بقدر

استعداد و شکی کہتے ہیں، مگر ان کو مرتبہ یقین حاصل نہیں ہوتا ہے۔

استقامت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اعمال کے ساتھ تین باتیں اور

ملائی جائیں تو یقین پیدا ہوتا ہے۔ ایک تو اعمال میں اخلاقی دوسرے

اعمالِ خیر کی زیادتی، تیسرے ان اعمال کی کیفیتِ خاصہ یعنی خشوع

وغیرہ۔

اصل دوم :- یقین سے مقامات پیدا ہوتے ہیں جو شیخ ابوطالب کی

کے حسبِ تحریر دس ہیں۔ توبہ، زہد، صبر، شکر، رجا، خوف، توکل،

رضا، فقر، محبت۔ جب یقین دل پر قبضہ کرتا ہے تو خوف ورجا سب

خُدائے متعلق ہو جاتا ہے اور اعتماد اسباب پر نہیں بلکہ مسبب الاسباب پر ہوتا ہے۔ یہ نہ جاننا کہ مقامات دس ہی ہیں، بلکہ اس کے سوا بھی ہیں، البتہ بنیادی اور اساسی مقامات ہی ہیں۔  
 اصل سوّم :- جب یقین کسی پر طاری ہوتا ہے تو وہ جو کچھ کہتا یا کرتا ہے، یقین سے کہتا اور کرتا ہے۔ مقامات عالیہ اُس کے سینے میں پیدا ہوتے ہیں اور دو امور ظاہر ہوتے ہیں، کراماتِ خادقہ اور تربیتِ مریداں“

(مقدمہ دوم ۱۴۲ و ۱۴۳)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ موصوف ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں ارشاد فرماتے ہیں :-

”مقامات و احوال کی بنیاد یقین پر ہے، یہ یقین ہی سے توحید و اخلاص، توکل، شکر، انس، ہیبت، تفرید، صدیقیت اور محمدیّت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں“

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ارشاد فرمایا کہ :-

”یقین ایمان ہے“

حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ :-

”مُجِبُّہُ کُوَ اِیْسَ اِیْقِیْنِ نَصِیْبُہُ فَرَاکَہُ دُنْیَاکِ مَعْصِیْتِیْ اَسَاہُ ہُوَ جَاہِیْنِ“

(مطبوعہ بریلی ص ۲۸۱)

مولانا اسمعیل صاحب شہید فرماتے ہیں :-

”جب دل رزائل سے صاف ہو جاتا ہے۔ فضائل مثلاً شجاعت،  
 قناعت، سخاوت، عفت، متبر و شکر، رفا اور توکل خود بخود حاصل  
 ہو جاتے ہیں۔“  
 (صراط مستقیم ص ۶۹)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کا ارشاد ہے :-  
 طالبِ حق کو چاہیے کہ اللہ سبحانہ کے ذکر میں ایسا مشغول ہو جائے  
 کہ غیر اللہ اور خود کو مطلقاً بھول جائے۔ کیونکہ وصول الی اللہ بغیر  
 نفی غیر اللہ کے حاصل نہیں ہوتا ہے۔ طالبِ حق جب اس درجہ  
 کو پہنچے گا، زہد، تقویٰ، توکل، عزلت، قناعت، متبر، تسلیم،  
 رفا سب بے قصد حاصل ہو جائیں گے۔“

(ضیاء القلوب ص ۱۳)

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں:-

» اخلاقِ ذمیرہ کے دو علاج ہیں، ایک جزئی یعنی خاص وہ کہ ہر  
 خلق کا جدا جدا علاج کیا جائے، جیسا احیاء العلوم وغیرہ میں لکھا ہے  
 اس کو طریقِ سلوک کہتے ہیں۔ دوسرا کلی یعنی عام، وہ یہ کہ ذکرِ دل  
 سے یا ہر طرح شیخِ کامل تجویز کرے۔ حق سبحانہ کی محبت قلب  
 میں پیدا کی جائے۔ جب اس کا غلبہ ہوگا، اپنی ہستی خودی مضمحل،  
 ہونا شروع ہوگی اور سب اخلاقِ ذمیرہ جو کہ اس خودی و دعویٰ ہستی سے  
 پیدا ہوتے ہیں نازل ہو جائیں گے۔ اس کو طریقِ جذب کہتے ہیں۔“

(کلیدِ ثنوی دفتر اول ص ۹)



اسی سلسلے میں پیر رومی کے یہ پُر جوش اشعار بھی پڑھ لیے جائیں :-

ہرگز جامہ نہ عشقے چاک شد      او از حرص و عیب کلی پاک شد  
شاد باش اے عشقِ خوش مودائے ما      اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما  
اے دوائے نخت و ناموس ما      اے تو افلاطون و جالینوس ما

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلے میں ایک عالم ربانی (اللہ ان کی برکات سے عرصہ تک استفادہ کا موقع نصیب فرمائے) کے گرامی نامہ کے چند الفاظ بھی نظر سے گذر جائیں۔ ارشاد فرمایا :-

”ضرورت اس کی بہت زیادہ ہے کہ اذکار میں پوری جدوجہد کی جائے، تا آنکہ ذکر طبیعتِ ثانیہ بن کر نسبت مع اللہ پیدا کرتا ہوا احساں ہو کہ خلاصہ اور ثمرۂ عبادت ہے، پیدا ہو جائے۔“

یہ ہے وہ یقین اور اس یقین کے ثمرات جس کی تحصیل کا ذریعہ تصوف ہے، اب اگر یہ امور کسی درجہ میں مطلوب ہیں تو تصوف بھی اسی درجہ میں مطلوب ہے۔  
والعلم عند اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ -

آخر میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ سطور بالا میں یقین کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا خشاء یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس سے کم درجہ کا یقین کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ حاشا وکلا ایسا نہیں ہے۔ یہاں تو بحث صرف کمال یقین کی تھی ورنہ خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق کوئی شخص یقین کا کمزور درجہ بھی اگر رکھتا ہے تو انشاء اللہ آخرت میں وہ بیکار نہ ہوگا۔ گو اہل ایمان کی

مان نی ہونا چاہیے کہ وہ ایمان و اسلام کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوں۔

حضرت شاہ اسماعیل صاحب کا ارشاد ہے کہ :-

» جو شخص ان احوال و مقامات سے متصف ہو، اُس کو چاہیے کہ

ان لوگوں کی تعظیم میں کوتاہی نہ کرے جو ان امور سے بے خبر ہیں، اس

لیے کہ ہر مسلمان حق تعالیٰ کا نام لیتا ہے۔ پس اول تو مسلمان کی تعظیم اس

نام پاک کی عظمت کی وجہ سے ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ آدمی خود اپنے

آغاز و انجام کو دیکھے۔ تیسرے حق تعالیٰ کے لیے دشوار نہیں کہ کسی کو

ایک لمحہ میں قطب الاقطاب بنا دیں «

(صراط مستقیم ص ۱۱)

شاہ صاحب ہی کا ارشاد ہے کہ :-

» اصلاح اعمال و عادات اور فضائل اخلاق کا جو ذکر ہوا تو رعنائی

حق کے لیے اور باہگاہ خداوندی میں مقبولیت، عزت اور اعتبار کے

لیے ہے، ورنہ مدارِ نجات تو صرف اسی کلمہ ہے جو صدق دل سے ادا

ہو « (صراط مستقیم)



(۶)

# تصوف اور شیخین

(از مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرانی)

تصوف کے انکار اور اس کی تنقید کے سلسلے میں بعض ملقود کی طرف  
 شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور امام ابن القیم کا نام بھی کثرت سے لیا  
 جاتا ہے۔ امید ہے کہ مولانا محمد اویس صاحب کا یہ مختصر مقالہ اس سلسلے میں  
 اہل انصاف کے لیے تسلی بخش ہو گا۔  
 (نعمانی خضر لہ)

حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی، حضرت  
 سید احمد شہید اور حضرت مولانا اسماعیل صاحب شہید کا نام لے کر اگر آج ہندوستان  
 میں تصوف صحیح کی مخالفت کی جائے تو اہل علم مخالف کے مبلغ علم کے متعلق اچھی رائے  
 نہ قائم کر سکیں گے۔

۱۲۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ و حافظ ابن قیم

اسی طرح اگر شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ دے کر حقیقی تصوف پر ناروا تنقید کی جائے تو جن لوگوں نے ان دونوں بزرگوں کی کتابوں کو پڑھا ہے اور جن کو ان بزرگوں (خصوصاً حافظ ابن قیم) کے تصوف و احسان میں مرتبہ کا کسی قدر کتابی علم ہے، وہ ان ناقدین کے متعلق زیادہ بہتر خیال ظاہر نہ کر سکیں گے۔

ہم امکان کی حد تک حسن ظن سے کام لینا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان ہاتھ پر لے کر شیخین کی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں فرمایا ہے۔ ورنہ شیخین کا نام لیکر وہ تصوف کی اس بیباکی کے ساتھ مخالفت نہ کرتے۔

لے یہاں ایک واقعہ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے، ایک مرتبہ راقم سطور نے اپنے استاد علامہ سید سلیمان ندویؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے یہاں چونکہ تقلب نہیں ہے اس لیے ان کی کتابوں میں بے حد جی لگتا ہے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ابھی آپ نے ابن تیمیہ اور ابن قیم کو نہیں پڑھا ہے جو فلسفیانہ باتیں کرتے ہیں، اس وقت تک عاجز رہنے شیخین کے فلسفیانہ اور مشکلانہ مباحث کو نہیں پڑھا تھا، پھر جب سید صاحب کی راہنمائی میں شرح عقیدہ اصفہانیہ کا مطالعہ کیا تو سید صاحب نے فرمایا :- جب علم کلام کی سیر کا جی چاہے تو ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ پکڑ کر میرے لیا کیجئے گا۔ بہت پر امن راستہ ہے۔“

اسی طرح یہ کہنے کا جی چاہتا ہے کہ لوگوں نے ابھی ابن تیمیہ اور ابن قیم کو بہت کم پڑھا ہے، جو تصوف کے مباحث میں عالمانہ کلام کرتے ہیں، ورنہ تصوف کے متعلق نقطہ نظر دوسرا ہوتا۔ ۱۲

بے شبہ شیخین کی کتابوں میں تصوف کے بعض مسائل پر سخت تنقید ملتی ہے، اسی طرح متصوفین پر وہ سخت دار و گیر بھی کرتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تنقید کن موفیہ پر اور کس تصوف پر ہے؟ کیا اس تصوف پر جو کتاب و سنت کا اصل مقصد ہے؟ جس کا فتنی و ضلالتی ہوتی ہے؟ جس میں قدم قدم پر کتاب و سنت کے اتناغ کا تکبیر ہے؟ جس کی تعلیم حسن بصری، ابراہیم بن ادہم، فضیل بن عیاض، معروف کرفی، بشر حافی، شلیق بلخی، جنید، سہل تستری، ابو طالب مکی اور شیخ عبدالقادر جیلانی نے دی ہے؟ یہ لوگ ہیں جن کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں :-

”یہ اسلام کے مشائخ ہیں، ائمہ ہدایت ہیں، خدا نے ان کے حق میں اُمت کے اندر لسان صدق“ رکھ دیا ہے“

(جلاء العینین ص ۵۹)

ابن ابراہیم بن ادہم، فضیل بن عیاض، معروف کرفی، ابوسلیمان دارانی، احمد بن الحواری، اور مرثیٰ مقلی کے متعلق ابن تیمیہ فرماتے ہیں :-

”واکا بر شیوخ الصالحین لہ“

ایک موقع پر فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادہم، ابوسلیمان دارانی، معروف کرفی، جنید بن محمد، سہل بن عبداللہ تستری اور انہی کے مثل لوگوں کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

”یہ کتاب و سنت کے مشائخ ہیں“

لہ فی السماع والرقوع - ۱۲

02470

پھر کہتے ہیں :-

”رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین“

تصوف اور اتباع سنت :-

حقیقی تصوف کی مخالفت تو درکنار، حافظ ابن قیمؒ تو دلائل و شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ :-

”طریق کتاب و سنت میں مقید ہے“

شیوخ عارفین کا اجماع نقل فرماتے ہیں کہ :-

”تصوف کتاب و سنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے“

اور بطور سند کے حسب ذیل بزرگوں کے اقوال نقل فرماتے ہیں :-

سید الطائفہ جنید، ابو حفص، ابوسلیمان دارانی، سہل بن عبد اللہ، سرہی،

ابو یزید، احمد بن ابی الحواری، ابو عثمان نیشاپوری، ابوالحسن قوری، محمد بن الفضل،

عمرو بن عثمان مکی، ابوسعید خدری، ابن عطاء، ابو حمزہ بغدادی (ان کو امام احمد بن

حنبلؒ موفی کہہ کر پکارا کرتے تھے)، ابواسحق رقی، ابویعقوب ترمذی، ابوالقاسم

نصر بازی، ابوبکر طستانی، ابو عمرو بن نجید۔

حافظ مایب موصوف فرماتے ہیں :-

۱۲۔ الفرقان میں اولیاد الرحمن و اولیاد الشیطان ص ۴۴۔

۱۳۔ مدارج السالکین جلد ۳ ص ۵۵۔

» اس راستہ سے جو صوفیہ الگ ہیں، وہ طریق کے رہن اور ابلیس کے کاہنوں ہیں «

ایک جگہ تصوف کے متعلق بحث فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ :-  
» تصوف سنت ہی پر عمل کا نام ہے «

اس موقع پر مسیحیوں میں اہل الاستقامة ائمة المطریق اور علمائے طائفہ کے اقوال سے استشہاد کرتے ہیں -

سری، سید الطائفہ جنید، ابراہیم بن محمد نصر آبادی، اسمعیل بن سنجید، احمد بن ابی الحواری، شبلی، ابو یزید بسطامی، سہل بن عبد اللہ -  
» اغاثة اللہقان « میں فرماتے ہیں :-

» اہل استقامة صحیح راستہ پر ہیں اور کتاب و سنت کے بغیر وہ خواہند  
ہو آجس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں « (ص ۶۸)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ :-

» کتاب و سنت کا ہر معاملہ میں لحاظ، اولیاء اللہ کے نزدیک  
متفق علیہ ہے اور مشائخ کے اقوال میں بہ کثرت اُس کی ہدایات  
موجود ہیں « ۷۵

۱۰ مدارج السالکین ج ۲ ص ۲۳۷

۱۱ ایضاً ج ۲ ص ۷۴

۱۲ الفرقان ص ۳۱ -

## فِنِ تَصَوُّوفِ كِى اہمیت :-

شیخ الاسلام ہر وی صفا کی بحث میں لکھتے ہیں کہ :-  
 ”اس کے تین درجے ہیں، پہلا درجہ اس علم کا ہے جو سلوک طریق کے  
 لیے انسان کو سنوارتا ہے۔“

حافظ ابن قیمؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ :-  
 ”جس علم صافی کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ وہی علم ہے جس کی قوم  
 (یعنی صوفیہ اصحابِ طریقت) نے وصیت کی ہے اور اس کی  
 مفادقت سے ڈرایا ہے اور جس نے اس علم کو چھوڑا، اس کو بالکل  
 اہل طریق میں سے نکال دیا ہے اور یہی وہ علم ہے جس کو حضرت  
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے تھے۔“

حضرت جنیدؒ ہمیشہ فرماتے تھے :-

”ہمارا یہ علم کتاب و سنت میں مقید ہے، پس جو کتاب و سنت سے  
 الگ ہو، اس کی پیروی نہ کی جائے۔ یہی وہ علم صافی ہے جو مشکوٰۃ  
 نبوت سے ماخوذ ہے، یہ اس علم والے کو طریق عبودیت پر چلنے

کے لیے سنوار دیتا ہے۔“

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ :-



”تصوّف سلوک حقیقی کا ایک گوشہ ہے اور اس کا کام نفس کی تہذیب اور اس کا تزکیہ ہے، تاکہ اس کو رفیقِ اعلیٰ کی صحبت کی سیر کے لیے تیار کر دے“<sup>۱</sup>

حضرت جنید کے قول اذا ادا الله بالمرید خیراً وقعہ علی الفقراء منعہ صحبۃ القراء کی شرح میں لکھتے ہیں :-

”قاری سے مراد ان لوگوں کے نزدیک وہ شخص ہے کہ جس کا رجحان عبادات کے ظاہر کی طرف ہو اور اہل تصوّف، اربابِ قلوب اور اہل معارف کے پاس جو ارواح معارف حقائق ایمان، رُوحِ محبت اور اعمالِ قلوب ہیں ان کو اس کی خبر نہیں ہے۔ پس جنید کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی پر خدا کا فضل ہوتا ہے اس کو صوفیہ کے پاس جانے کی توفیق ملتی ہے جو اس کے اخلاق کی تہذیب کرتے ہیں۔ ذمائم اخلاق کا ازالہ کرتے ہیں، منازلِ طریقی کی خبر دیتے ہیں اور قراء صرف ظاہری عبادات پر لگاتے ہیں اور اعمال کی پاشنی نہیں سکھاتے ہیں“

حافظ ابن قیمؒ اس سلسلہ میں اپنا مشورہ دیتے ہیں کہ :-

”دو ہوش مند کا کام یہ ہے کہ ہر جگہ سے وہ اپنا حصّہ لے اور ہر جماعت سے بہتر معاملہ کرے، یہ طریقہ صادقین کا ہے“<sup>۲</sup>

۱۔ مدارج السالکین جلد ۲ ص ۱۷۱ ایضاً ص ۲۰۷ عہ ترجمہ :- اللہ تعالیٰ جب مرید

کے ساتھ جہان کا ارادہ کرتا ہے تو فقراء کی صحبت میں ڈال دیتا ہے اور قراء کی صحبت سے روک دیتا ہے

حقیقی تقووت اور صحیح صوفیہ کے متعلق شیخین کی تصریحات بالاکے بعد کیسے کہا جا سکتا۔ کہ یہ حضرات تقووت کے مخالف تھے۔

اصل یہ ہے کہ ناقدین کو غلط فہمی ہے، ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تنقید تقووت اور اہل حق صوفیہ پر نہیں ہے، بلکہ ان کو فلسفیانہ تقووت سے اختلاف ہے۔ فلسفیانہ تقووت کسے کہتے ہیں؟ اس کو حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کی زبان سے سنئے :-

”فلسفیانہ تقووت سے مقصود النیات کے متعلق حکیمانہ خیالات اور فلاسفہ کی طرح خشک زندگی اختیار کر کے ان کی اخلاقی تعلیمات پر عملی کرنا ہے، اس فلسفیانہ تصوف کا ماخذ یونان کا اشرافی اور اسکندریہ کا افلاطونی اسکول ہونا بعض قدیم مسلمان حکماء کے نزدیک بھی مسلم تھا“

مشہور حکیم ابوریحان البیرونی کہتا ہے کہ :-

”دوسو یونانی میں حکمت کو کہتے ہیں اور اسی سے فلیسوف کو یونانی میں ”فیلوسوف“ کہتے ہیں، یعنی حکمت کا عاشق، چونکہ اسلام میں بعض لوگ ان کے قریب گئے، اس لیے وہ بھی اسی نام (صوفیہ) سے پکارے گئے“

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ ”فی السماع والرقص“ میں

لکھتے ہیں :-

”اور ابن سینا نے ایک فلسفہ پیدا کیا، جس کو اُس نے پہلے کے

یونانی فلاسفہ اور (مسلمانوں میں سے) بدعتی متکلمین جھیمہ وغیرہ کے خیالات سے ملا کر بنایا تھا اور بہت سی علمی اور عملی باتوں میں وہ اسماعیلی طہدوں کے راستے پر چلا اور کچھ باتیں اس میں صوفیہ کی ملاپی جو حقیقت میں اسس کے ہم خیال اور اسماعیلی قرامطہ باطنیہ کے خیالات سے ماخوذ تھیں، کیونکہ ابن سینا کے اہل خاندان مصر کے حاکم بامر اللہ (فاطمی اسماعیلی) کے پیروؤں میں سے تھے۔ یہ لوگ اسی زمانہ میں تھے اور ان کا مذہب رسائل انخوان العفاد والوں کا مذہب تھا۔“

ماجی خلیفہ چلپی "کشف الظنون" میں تصوف کے ضمن میں لکھتا ہے کہ :-

”اور جانا چاہیے کہ حکمائے الہیات میں سے اشراقی مشرب اور اصطلاح میں صوفیوں کے مانند ہیں۔ خصوصاً ان میں سے پچھلے (اشراقی) لیکن فرق صرف ان مسائل میں ہے جن میں اشراقیہ کا مذہب اسلام کے مخالف ہے اور یہ کچھ بعید نہیں ہے کہ یہ اصطلاح (تصوف) انہی کی اصطلاح (سوت) سے ماخوذ ہو جیسا کہ اس شخص سے چہا نہیں ہے، جس نے اشراقی فلسفہ کی کتابیں دیکھی ہیں۔“

ان حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ فلسفیانہ تصوف، فلسفہ اشراق، جدید افلاطونی الہیات اور انخوان العفاد کی تاویلات ایک ہی سرشت کی دھاریں ہیں۔

(خاتم مختصراً)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کو اسی فلسفیانہ تعقوف سے اختلاف تھا اور اسی تعقوف سے پیدا شدہ مسائل پر وہ کڑی تنقید کرتے تھے۔ خود ابن تیمیہؒ کہتے ہیں :-

«ان لوگوں نے تعقوف میں گفتگو کی، لیکن مسلمانوں کے طریق پر نہیں، بلکہ فلاسفہ کے طریق پر» ۱۷

رسالہ «علم الظاہ والباطن» میں باطنیہ اور قرامطہ کی تلبیسات کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

«اور اسی قسم کی بہت سی باتیں مشکلیں صوفیہ کے کلام میں راہ پاگئیں» ۱۸

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ زناوۃ صوفیہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

«طریق کے گاہن زناوۃ صوفیہ اور ملاحظہ وہ ہیں جو پیغمبر کی پیروی کو طریق میں ضروری نہیں جانتے ہیں» ۱۹

شیخین بلکہ تمام علماء و حق کی مخالفت اسی طبقہ صوفیہ سے ہے، ورنہ جہاں تک صحیح تعقوف اور اہل حق صوفیہ کا معاملہ ہے، شیخین ان کا اعتراف اور پورا احترام کرتے ہیں۔ ابن تیمیہؒ ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ :-

۱۷ جلاء العینین ص ۲۴ . ۱۸ مجموعہ رسائل میریہ (داؤل)

۱۹ مدارج السالکین -

”صوفیہ میں بعض مسلکین کے طریق پر ہیں اور بعض اہل فلسفہ کے طریق پر اور ایک جماعت وہ ہے جو اہل حق کے مسلک پر اور سنت پر ہے۔ جیسے فضیل اور تمام وہ لوگ جن کا امام قشیری نے رسالہ میں ذکر کیا ہے“

رسالہ قشیری بڑی آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے، اس میں تراسی اکابر صوفیہ کا ذکر ہے، ابن تیمیہ ان کو مسلک اہل السنۃ پر مانتے ہیں اور یہی وہ حضرات ہیں کہ محققین صوفیہ آج بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔  
ابن تیمیہ نے اپنے رسالہ ”فی السماع والرقص“ میں عالمی صوفیوں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :-

”یہ لوگ محققین صوفیہ اور ان کے ائمہ کے برعکس ہیں“  
معلوم ہوا کہ ابن تیمیہ کو ”محققین صوفیہ“ سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حافظ ابن قیم نے مدارج السالکین میں صوفیہ کی صحابہ کرام کے احوال کے اعتبار سے بیان کی ہیں اور ان کی مدح فرمائی ہے :-  
ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ :-

”حضرات صحابہ کرام اور اُمت کے دوسرے کا طین علم اور حال دونوں کے جامع تھے، جب اہل علم اور اہل حال میں تفریق

لے جلاء العینین ص ۳۵ -

لے مدارج السالکین (جلد ۳) ص ۸۱ -

ہوگئی، اسی وقت سے نقص اور خلل پیدا ہو گیا۔  
 ابو العباس بن المظریف نے اپنی کتاب ”محاسن المجالس“ میں محبت اور شوق  
 پر گفتگو کی ہے۔ حافظ ابن قیمؒ اس پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”ہم ان کے کلام کو ذکر کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے  
 جو معنایں منکشف فرمائے ہیں، اُن کو بھی نفع کی اُمید پر لکھتے ہیں،  
 اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر احسان فرمائے اور اُس کو علم سے  
 حال کی طرف اور وصف سے اتصاف کی طرف لے جائے۔  
 یعنی اُس کے علم کو اُن کا حال بنا دے، اور ان اوصاف کا  
 مقصد بنا دے۔“

باب الذوق میں فرماتے ہیں کہ :-

”جن لوگوں نے ایمان کا دعویٰ کیا، لیکن وہ صاحبانِ ذوق نہ  
 تھے، حق تعالیٰ نے اُن سے فرمایا کہ اپنے کو مومن نہ کہو، مسلم کہو  
 قالت الاعراب امانا قل لم تومنوا و لکن قولوا  
 اسلمنا و لعلنا ندخل الایمان فی قلوبنا  
 پس یہ لوگ مسلمان ہیں، مومن نہیں، اس لیے کہ ایمان اُن کے  
 دل کے اندر چا نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صاحبِ ذوق نہ ہونے

۱۔ مدارج السالکین، جلد ۳، ص ۸۲۔

۲۔ طریق الہجرتین، ص ۳۸۔

کی وجہ سے یہ لوگ دائرہ اسلام سے خارج ہیں، یا ان کے اعمال کے اجر میں کمی ہوگی (البتہ صاحبِ ذوق کا معاملہ ہی دوسرا ہے) ذوق ایک باطنی امر ہے اور عمل اس کا نشان ہے۔ پس اعمالِ علوم و عقائد کے ثمرات ہیں اور یقین سے جہاد اور احسان کے مقامات پیدا ہوتے ہیں“ ۱۷

ذرا غور کیجئے کہ یہ جلیل القدر شیخ اذواق صحیحہ اور احوالِ صالحہ (جو کہ ثمراتِ مجاہدات میں سے ہیں) کا کیا مدارج ہے ؟  
 ”مدارج السالکین“ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ :-

”میں نے صوفیہ کی صحبت اختیار کی اور ان کی دو باتوں سے بڑا نفع اٹھایا، ایک یہ کہ وقت ایک تلوار ہے۔ اگر تم اس کو نہ کاٹو گے تو وہ تم کو کاٹ دے گا اور دوسری بات یہ کہ اگر تم اپنے نفس کو حق میں مشغول نہ کرو گے تو وہ تم کو باطل میں مشغول کر دے گا“  
 حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ :-

”یہ کتنے قیمتی فقرے ہیں اور اپنے قائل کے علو بہت پر دلالت کرتے ہیں اور امام شافعیؒ کی یہ منقبت اس طبقہ (صوفیہ) کی جلالتِ شان کے لیے کافی ہے“ ۱۸

۱۷ مدارج السالکین ج ۳ ص ۵۰ ۱۸ ایضاً ص ۵۰

شیخین کو صوفیہ کے جس مسئلہ سے زیادہ تر اختلاف تھا وہ وحدت الوجود کا مسئلہ تھا۔ جس وحدت الوجود سے ان کو اختلاف تھا اس کی حقیقت بھی انہی کی زبان سے سن لیجئے۔

» اس وحدت الوجود کی غایت یہ ہے کہ اس کے ماننے والے عبدا اور معبود خالق اور مخلوق امر اور مامور طاعت اور مصیبت میں فرق نہیں کرتے۔ ملاحظہ اہل وحدت الوجود کے نزدیک غیر حق، عین حق میں گم ہو جاتا ہے، بلکہ غیر حق کا وجود نفس حق کا وجود ہوتا ہے، جس دونوں وجودوں میں فرق کرتا ہے۔ لیکن جب اس فائب ہوتا ہے تو گمل جاتا ہے کہ غیر حق کا وجود عین حق ہے۔“

اس وحدت الوجود کے متعلق خود متفقین صوفیہ کا مسلک کیا ہے؟ ذرا اس کو بھی گوش ہوش سے سنئے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ارشاد ہے :-

» عینیت کے یہ معنی نہیں کہ دونوں ایک ہو گئے، یہ تو صریح کفر ہے۔“

اب اس مسئلہ کی اصل حقیقت بھی مولاناؒ سے سمجھ لیجئے :-

» گو ممکنات موجود ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وجود دیا ہے۔ موجود کیوں نہ ہوتے، مگر وجود حق کے دو بروان کا وجود نہایت ناقص و ضعیف و حقیر ہے، اس لیے وجود ممکن کو وجود حق کے دو برو گو عدم نہ کہیں گے مگر کالعدم ضرور کہیں گے، جب یہ کالعدم ہوا تو وجود معتد بہ

لہ العقل البلی بحاشیہ جلد العینین ص ۲۶۰ طریق المہجرتین ص ۳۲۳ -

۳۰ مدارج السالکین ج ۳ ص ۴۵۰ بح تعلیم الدینی ج ۱ ص ۹۵ -



ایک ہی راہ گیا۔ یہی معنی ہیں وحدت الوجود کے، کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ ہے ایک ہونا وجود کا۔ سو ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اگر ہے سہی، مگر ایسا ہی ہے جیسا نہیں، مگر اس کو اذکار وحدت الوجود کہا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کو مرتبہ تحقیق علمی میں توجید کہتے ہیں جس کی تحصیل کوئی کمال نہیں اور جب یہ سالک کا حال بن جائے تو اس مرتبہ میں فنا کہلاتا ہے، یہ البتہ مطلوب و مقصود ہے اور یہی حاصل ہے وحدۃ الشہود کا جس کی دلالت اس معنی پر بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ اس کا ترجمہ ہے ایک ہونا شہود کا، کہ واقع میں تو ہستی متعدد ہیں، مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور سب کا عدم معلوم ہوتے ہیں۔ پس وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں اختلاف لفظی ہے۔ کما قال مرشدی مگر چونکہ وحدۃ الوجود کے معنی حوام میں فلفظ مشہور ہو گئے تھے اس لیے بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا۔

مسئلہ کی اس تفصیل کو ذہن میں رکھتے اور اب دیکھئے کہ شیخین کے ارشادات اس سلسلہ میں کیا ہیں؟ حافظ ابن قیمؒ کی ایک تقریر کا مفہوم حسب ذیل ہے۔

”جب طرح انوار مخلوق نور حق کے سامنے اور علم خلق علم حق کے سامنے اور مخلوق کی قدرت خدا کی قدرت کے سامنے منہمک ہے، اسی طرح

لے کلید غنوی شرح شعرہ

جملہ معشوق است و عاشق پرودہ  
زندہ معشوق است و عاشق مردہ

زمان ، دہر اور وقت دوام الہی کے سامنے مضمحل ہے۔ جب سالک پر یہ استغراق طاری ہوتا ہے، قوت تمیز کمزور ہوتی ہے اور حال غالب ہوتا ہے تو اہل استقامت کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ  
 ما خلف الوجود الا الله۔ ما من موجود الا حقيقة الله  
 هنا لا يفنى من لم يكن وبقی من لم یزل  
 بے شبہ وجود حق اور جب اُس کا دوام ماسویٰ پر غالب آتا ہے تو ہر چیز ایسی ہوتی ہے جیسے کہ وہ نہیں ہے اور ہمیں سے وہ وجود کے قائلوں کو غلط فہمی ہو گئی کہ واقعی کوئی دوسرا وجود نہیں ہے۔ اور اس قسم کے مشتبہ کلمات کو (جو اہل استقامت کی زبان سے نکل گئے) انہوں نے اپنے کفر کا سبب بنیاد قرار دے دیا۔“

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فناء کی تین قسمیں کرتے ہیں :- پہلی فناء انبیاء اور کاملین اولیاء حقہ ہے۔ دوسری قسم قاصدین اولیاء و صالحین کو نصیب ہوتی ہے، اس دوسری قسم کی ضمن میں شیخ فرماتے ہیں :-

”دوسری قسم ماسواء کے شہود سے فناء ہے اور یہ اکثر سالکین کو پیش آتی ہے۔ خدا کی محبت، عبادت اور یاد کی طرف التجذاب سے یہ صورت پیدا ہوتی ہے۔ محبوب و مطلوب کا استغراق غیر کا شعور نہیں باقی رہنے

لے مدارج السالکین ج ۳ ص ۶۶۔ اس بحث کو طریق المہجرتین ص ۳۳۳۔ نیز مدارج السالکین

جلد اول ص ۶۳ میں ملاحظہ کیا جائے۔ ۱۲

دیتا ہے۔ پس موجود کا وجود، مشہود کا مشہود اور مذکور کا ذکر اس سے غائب ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مخلوق (اس کی نگاہ میں) فنا ہو جاتی ہے اور صرف خدا باقی رہ جاتا ہے (چونکہ پہلی قسم کی فنا سے اس فنا کا درجہ کم ہے، اس لیے) انبیاء اور اکابر اولیاء اللہ مثلاً حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور سابقین اول کو یہ فنا پیش نہیں آئی۔ ان امور کی ابتداء تابعین کے عہد سے ہوئی ہے اور شیوخ موفیہ سے مثلاً ابویزیدؒ، ابوالحسن نوریؒ، ابوبکر شبلیؒ وغیرہ کو یہ حالات پیش آئے اور ان کے سوا ابوسلیمان درانیؒ، معروف کرخیؒ، فضیل بن عیاضؒ، بلکہ جنیدؒ کو بھی یہ صورت پیش نہیں آئی۔ ۱

غور کیجئے کہ محققین موفیہ کے وحدت الوجود یا وحدت الشہود میں اور شیخین کی

بیان کردہ اس فناء میں کیا فرق ہے ؟

کوئی شبہ نہیں کہ فنا کے اس مرتبہ کو شیخین وہ اہمیت نہیں دیتے ہیں جو فنا کی پہلی قسم کو ان کے نزدیک حاصل ہے، مگر اس مرتبہ کو نہ صرف یہ کہ وہ گمراہی نہیں قرار دیتے ہیں بلکہ اقرار کرتے ہیں کہ حضرات تابعین کے وقت سے یہ کیفیات پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ حافظ ابن قیمؒ کی وسعت خیال کا تو یہ عالم ہے کہ اگر سالک غلبہٴ مال میں "سبحانی" یا "ما فی الحجة لا اللہ" کہہ دے تو وہ اس کو بھی معذور اور معافی کے لائق جانتے ہیں۔ ۲

۱۔ العبودیتہ ص ۹۸۔

۲۔ مدارج السالکین ج ۱ ص ۱۰۷ و طریق الہجرتین -

قصہ مخفیہ ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کا حوالہ دیکر تصوف صحیح کی مخالفت کرنا ہرگز قرین انصاف نہیں ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی کتابوں کو

لے ن تصوف پر حافظ ابن قیم کی سب سے مفصل کتاب مدارج الصالحین ہے جو تین جلدوں میں علامہ رشید رضا معری مرحوم کے اہتمام میں چھپی ہے، اسکے ٹائٹل پیج پر درج ہے :-

مدیر وہ کتاب ہے جس میں تصوف اور معارف الہیہ کے حقائق کتاب و سنت اور سلف صالحین کی مطابق بیان کئے گئے ہیں، معری کے ایک مشہور عالم شیخ حامد فقہی (جو شین کے خاص مجتہدین میں سے ہیں اور ان کے علوم کی نشرو اشاعت کا بہت شوق رکھتے ہیں) کو بڑا غم ہے کہ حافظ ابن قیم نے اس کتاب میں شیوخ صوفیہ سے بجز نقل کیوں کیا ہے اور ان کے کلام کو اسلامی کیسے قرار دے دیا ہے؟ (حاشیہ الجہودیتہ ص ۲۹)۔

شیخ حامد کو یہی شکایت ابن تیمیہ سے بھی ہے کہ انہوں نے مشائخ صوفیہ کی تعریف کیوں کی ہے؟ (حاشی الجہودیتہ) الشراکبر ایہ للناس اعداء لما جعلوا کی کسی دردناک صورت حال ہے۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی ہر رائے بہتر اور قابل ترجیح، لیکن جب وہ کوئی ایسی چیز بیان کریں جس کو اپنا نفس نہ قبول کرے تو وہ کسی دلیل کے بغیر رد کر دی جائے؟

علامہ رشید رضا معری نے اس کتاب پر ایک مقدمہ لکھا ہے۔ انہوں نے بھی تصوف کے متعلق عام خیال بہتر نہیں ظاہر کیا ہے مگر مجبوراً یہ اقرار کرتے ہیں کہ بے شبہ صوفیہ کے حقائق ہیں جن کے سامنے فقہاء و متکلمین کی گردنیں جھک گئی ہیں اور یہ درحقیقت علماء کلماء ہیں۔ اسی دیا چر میں کہتے ہیں کہ صالح صوفیہ امرار شریعت کے بیان اور تربیت اخلاق کے ذریعہ سے اسلام کی خدمت کی ہے۔“

پڑھا جائے، دیکھا جائے کہ یہ مسائل تصوف پر کسی عالمانہ بحث فرماتے ہیں، مشائخ کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ صحیح و سفیم میں امتیاز کرتے ہیں۔ راجح و مرجوح میں فرق فرماتے ہیں۔ موفیہ کے درمیان مختلف فیہ مباحث میں محاکمہ کرتے ہیں۔ اگر یہ اس راہِ حق کے دہرو اور بحر معرفت کے شناور نہ ہوتے تو اس فن میں یہ مرتبہ پانا ممکن نہ تھا۔ اقوال کے سوا خود ان کے احوال کو ملاحظہ کیجئے۔ ذکر الہی کی کثرت، عبادات میں خشوع و خضوع اور بتل الی اللہ کا کیا عالم تھا؟ اگر طولِ بحث کا خوف نہ ہوتا تو میں ان احوال کو نقل کرتا جو حافظ ابن قیمؒ نے "مدارج السالکین" میں ابواب تصوف کے ماتحت حافظ ابن تیمیہؒ کے متعلق نقل فرمائے ہیں۔ یہی اسباب ہیں کہ ملاحظی قاری نے مراجعت فرمایا ہے کہ :-

«جو شخص منازل السائرین کی شرح و مدارج السالکین کو دیکھے گا اس پر واضح ہو جائیگا کہ یہ دونوں حضرات (ابن تیمیہؒ و ابن قیمؒ) نہ صرف یہ کہ اہل سنت و الجماعت میں سے ہیں، بلکہ اس امت کے اولیاء میں سے ہیں جو حافظ ابن رجب حنبلی کہتے ہیں :-

«ابن قیمؒ کو تصوف میں بڑا مرتبہ حاصل تھا اور ان کو ازواج و مواجید میصومہ کا بڑا حصہ ملا تھا، جس پر ان کی کتابیں شاہد ہیں۔»

ان حقائق کے انکشاف کے بعد ہمارے ناقدین اور معترضین شیخین کی کتابوں کو پڑھیں اور فیصلہ کریں کہ ان بزرگوں کو کس تصوف سے اختلاف تھا؟

۱۔ مرقاة شرح مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۷۴ -

۲۔ جلاء العینین ص ۲ -

اگر فلسفیانہ تصوف کے سوا صحیح تصوف میں بھی کسی موقع پر انہوں نے اختلاف ظاہر کیا ہے تو اس پر غور کیجئے کہ یہ اختلاف تصوف کے اصول و مقاصد سے ہے یا فروع میں۔ آپ یقین کریں کہ ان دونوں بزرگوں کو تصوف کے اصول اور مقصد سے مخالف کہیں نہ پائیں گے باقی فروع میں اختلاف کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ نیز یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ ابن تیمیہ اور ابن قیمؒ بااثر ہمہ جلالہ قدرت و رفعت شان بہر حال غیر معصوم انسان تھے، جس طرح دوسروں کی رائے غلط ہو سکتی ہے اسی طرح وہ بھی غلطی کر سکتے ہیں اور ان کا اختلاف مسئلہ کے سقم کی نشانی نہیں ہے۔ اور اگر ان کا اختلاف صحیح بھی ہے تو کسی مسئلہ میں اختلاف کے یہ کب معنی ہیں کہ پورے فن کے مخالف تھے۔ بہتر ہو کہ ہمارے ناقدین خود حافظ ابن قیمؒ کی رائے کو قبول کر لیں جو انہوں نے شطحات صوفیہ کے ضمن میں ظاہر کی ہے۔ فرماتے ہیں :-

«ان شطحات سے دوسریں پیدا ہوئیں، ایک یہ کہ ان شطحات کی وجہ سے ایک جماعت ان بزرگوں سے بدظن ہو گئی اور ان کی پاکیزگی نفس، صدق معاملہ اور محاسن ان سے چھپ گئے اور ان حضرات کا مطلقاً انکار کر دیا گیا۔ لوگ ان سے بدگمان ہو گئے، حالانکہ یہ مریض زیادتی ہے۔ کیونکہ جس شخص سے کوئی غلطی ہو جائے اگر اس کے تمام محاسن کا انکار کر دیا جائے تو تمام علوم اور صناعات بیکار ہو جائیں اور ان کے نشانات مٹ جائیں۔ دوسری مصیبت یہ کہ بعض بزرگوں نے ان بزرگوں کے محاسن، صفاء قلب اور حسن معاملہ کو دیکھ کر ان کے شطحات کو بھی قبول کر لیا۔ ان سب

ہیں صحیح تر وہ لوگ ہیں جو ہر چیز کو اپنے مرتبہ میں رکھتے ہیں۔ صحیح کو قبول کرتے اور غلط کو رد کرتے ہیں۔“ لے

یہی حافظ ابن قیمؒ ”مدارج السالکین“ میں ایک موقع پر شیخ الاسلام ہر وی سے اختلاف کرتے ہیں، مگر فوراً ناظرین کو متنبہ کرتے ہیں کہ :-

”یہ غلطی شیخ الاسلامؒ سے بدظن نہ کر دے اور ان کے محاسن کو نظر سے گرانہ دے، اس لیے کہ علم امامت معرفت اور سلوک میں ان کا جو مرتبہ ہے وہ پورے مشیدہ نہیں ہے۔“ لے

حافظ موصوفؒ کی یہی انصاف پسندی ہے کہ شیخ الاسلام حبیب الینا والحق حب الینا منہ، کے پیش نظر وہ ہر وی سے جا بجا اختلاف بھی کرتے ہیں لیکن ان کے محاسن اور رسوخ علم کے اعتراف میں بھی پیش پیش ہیں، ایک موقع پر کہتے ہیں :-

”استشہادہ بہذہ المایۃ فی ہذا الباب یدل علی رسوخہ فی العلم والمعرفتہ والمقرآن“ لے

اور انجام کار یہی حافظ ابن قیمؒ انہیں صوفی شیخ الاسلام ہر وی کے متعلق کہتے ہیں :-

”اللہ شیخ الاسلام کی سعی کو مسکود فرمائے، ان کے درجے بلند فرمائے، انکو بہترین جزا دے اور ان کے محل کرامتہ میں ہم کو اور ان کو جمع فرمائے۔“ لے

اب خاتمہ سخن پر خاکسار کو یہ عرض کرنا ہے کہ جن لوگوں کو شیخ الاسلام

لے ”مدارج السالکین“ ج ۲ ص ۱۰۸ لے ایضاً ج ۱ ص ۱۹  
 لے ایضاً ج ۳ ص ۱۲۲ لے ایضاً ج ۲ ص ۲۴۰

ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حضرت مجدد الف ثانی اور مولانا اسمعیل شہید سے حسن ظن ہے ان کو علمائے حق میں سے جانتے ہیں یا تو وہ یہ فیصلہ کر لیں کہ یہ سب حضرات با ایں ہمہ اتباع سنت ایک غلط چیز کو قبول کرنے پر متفق ہو گئے تھے؟ اور ان سب نے عمداً یا جلا امت کو نادرست چیز کی تعلیم و تلقین کی؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خود اپنے متعلق غور کریں کہ کہیں اس باب میں انہی سے تو غلطی نہیں ہو رہی ہے؟

ناچیز راقم کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ ہمارے یہ معترفین و ناقدین اتنے اعتراضات تنقید کے وقت اس مرویہ تصوف کو پیش نظر رکھتے ہیں جس کی یاد گاہ میں گستاخی کے مجرم ہم نیاز مند بھی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہ طرح اسرائیلیات کی بنا پر تفسیر کو، موضوعات کی بنا پر فن حدیث کو اور مرجوع مسائل کی بنا پر دفاتر فقہ کو رد نہیں کرتے ہیں۔ اسی طرح تصوف کے نام پر آج بہت سی فائعات ہوں اور مزادوں پر جو کچھ ہوتا ہے اس کی بنا پر نفس تصوف کو ہم رد نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ بحمد اللہ اصل اور نقل کے امتیاز کو پیش نظر رکھتے ہیں۔





# اہل تصوف اور دینی جدوجہد

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دنیا میں بہت سی چیزیں بعض خاص اسباب کی بناء پر بغیر علمی تنقید و تحقیق کے تسلیم کر لی جاتی ہیں اور ان کو ایسی شہرت و مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے کہ اگرچہ ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہوتی مگر خواص بھی ان کو زبان و قلم سے بے تکلف دہرانے لگتے ہیں۔ انہی مشہورات بے اصل میں سے یہ بات بھی ہے کہ تصوف، تعطل و بے علمی حالات سے شکست خوردگی اور میدان جدوجہد سے فرار کا نام ہے لیکن عقلی و نفسیاتی طور پر بھی اور علمی اور تاریخی حیثیت سے بھی ہمیں اس دعوے کے خلاف مسلسل طریقہ پر داخلی و خارجی شہادتیں ملتی ہیں۔

سیرت سید احمد شہیدؒ میں تزکیہ و اصلاح باطن کے عنوان کے ماتحت خاکسار رقم نے حسب ذیل الفاظ لکھے تھے، جس میں آج بھی تبدیلی کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی اور اس حقیقت سے پہلے سے زیادہ یقین پیدا ہو گیا ہے۔

”یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سرفروشی و جاننازی، جہاد و قربانی اور  
 تجدید و انقلاب و فتح و تسخیر کے لیے جس روحانی و قلبی قوت، جس وجہات و  
 شخصیت، جس اخلاص و ولایت، جس جذب و کشش اور جس حوصلہ اور  
 ہمت کی ضرورت ہے وہ بسا اوقات روحانی ترقی، صفائی باطن،  
 تہذیب نفس، ریاضت و عبادت کے بغیر نہیں پیدا ہوتی۔ اس لیے  
 آپ دیکھیں گے کہ جنہوں نے اسلام میں مجددانہ یا مجاہدانہ کارنامے انجام  
 دیئے ہیں، ان میں سے اکثر افراد روحانی حیثیت سے بلند مقام رکھتے  
 تھے۔ ان آخری صدیوں پر نظر ڈالیے۔ امیر عبدالقادر الجزائری، مجاہد  
 جزائر، محمد احمد السودانی (مدی سوڈانی) سید احمد شریف السنوسی  
 (امام سنوسی) کو آپ اس میدان کا مرد پائیں گے۔ حضرت سید احمد ایک  
 مجاہد قائد کے علاوہ اور اس سے پہلے ایک عزیز القدر روحانی پیشوا  
 اور بے مثل شیخ الطریقیت تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجاہدت و ریاضیات،  
 تزکیہ نفس اور قرب الہی سے عشق الہی اور جذب و شوق کا جو مرتبہ حاصل  
 ہوتا ہے اس میں ہر روئنگے سے یہی آواز آتی ہے کہ  
 ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر۔  
 مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں  
 اس لیے روحانی ترقی اور کمال باطنی کا آخری اور لازمی درجہ شوق شہادت  
 ہے اور بہرے کی تکمیل جہاد ہے۔“

۱۰ سیرت سید احمد شہید طبع ثانی ص -

نفسیاتی پہلو سے غور کیجئے گا تو معلوم ہو گا کہ یقین اور محبت ہی وہ شہپر ہیں، جن سے جہاد و جدوجہد کا شہباز پرواز کرتا ہے، مرغوبات نفسانی، عادات و مالوفات آدمی مصالح و منافع، اغراض و خواہشات کی پستیوں سے وہی شخص بلند ہو سکتا ہے اور لکنہ اخلاقی الامرن و اتبعہ و الا کے دام ہمزنگ زمین سے وہی شخص بچ سکتا ہے جس میں کسی حقیقت کے یقین اور کسی مقصد کے عشق نے پارہ کی تقدیر سیماںی اور تجلیوں کی بے تابی پیدا کر دی ہو۔

انسانی زندگی کا طویل تجربہ ہے کہ محض معلومات و تحقیقات اور مجرد قوانین و ضوابط اور صرف نظم و ضبط، مرفوشی و جاننازی بلکہ سہل تر ایثار و قربانی کی طاقت و آمادگی پیدا کرنے کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے اس سے کہیں زیادہ گہرے اور طاقتور تعلق اور ایک ایسی روحانی لاپچ اور غیر مادی فائدہ کے یقین کی ضرورت ہے کہ اس کے مقابلہ میں زندگی باہر دوش معلوم ہونے لگے کسی ایسے ہی موقع اور حال میں کہنے والے نے کہا تھا ۵

جان کی قیمت دیارِ عشق میں ہے کوٹے دوست

اس نوید جان فزا سے مردِ وبال دوش ہے

اس لیے کم سے کم اسلام کی تاریخ میں ہر مجاہدانہ تحریک کے سرے پر ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے جس نے اپنے حلقہ مجاہدین میں یقین و محبت کی بیج روح بھونک دی تھی اور اپنے یقین و محبت کو سینکڑوں ایسے نیراروں انسانوں تک منتقل کر کے ان کے لیے تن آسانی اور راحت طلبی کی زندگی دشوار اور پامردی اور شہادت کی موت آسان و خوشگوار بنا دی تھی اور ان کے لیے جینا اتنا ہی مشکل ہو گیا تھا، جتنا دوسروں کے لیے مرنا مشکل تھا،

یہی سرملقہ و امام وقت ہے جس کے متعلق اقبال مرحوم نے کہا ہے

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق

جو تجھے حاضر و موجود سے بیزاد کرے

موت کے اٹینے میں تجھ کو دکھا کر رُخ دوست

زندگی اور بھی تیرے لیے دشوار کرے

دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گر مادے

فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

معمولی و معدّل حالات میں قوموں کی قیادت کرنے والے، فتح و نصرت کی

حالت میں لشکروں کو لڑانے والے ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ اس کے لیے کسی غیر

معمولی یقین و شخصیت کی ضرورت نہیں، لیکن مایوس کن حالات اور قومی اختصار کی کیفیت

، صرف وہی مرد میدان حالات سے کش مکش کی طاقت رکھتے ہیں جو اپنے خصوصی

تعلق باللہ اور قوتِ ایمانی و روحانی کی وجہ سے خاص یقین و کیفیتِ عشق کے

مالک ہوں۔ چنانچہ جب مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے تاریک و قفے آئے کہ ظاہری

علم و حواس و قوتِ مقابلہ نے جواب دیدیا اور حالات کی تبدیلی امر محال معلوم ہو گئی

گئی تو کوئی صاحبِ یقین و صاحبِ عشق میدان میں آیا، جس نے اپنی جراتِ رزاق

اور کیفیتِ عاشقانانہ سے زمانہ کا بہتا ہوا دھار بدل دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے

بیخبر الخی و ما المیت اور یحییٰ الاموات بعد موتھا کا منظر دکھا دیا۔

تاریخوں نے جب تمام عالمِ اسلام کو پامال کر کے رکھ دیا، جلال الدین خواجہ شاہ

کی واحد اسلامی سلطنت اور عباسی خلافت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا تو تمام

عالم اسلام پر یاکس و مردنی چھا گئی۔ تانا دیوں کی شکست نامکن الوقوع چیز سمجھی جانے لگی اور یہ مثل زبان و ادب کا جزو بن گئی کہ اذا قيل لا ان التنا انهن موطلا تصدق (اگر تم سے کوئی کہے کہ تانا دیوں نے کہیں شکست کھائی تو کہیں یقین نہ کرنا) اس وقت کچھ صاحب یقین و صاحب قلوب مروان خدا تھے جو مایوس نہیں ہوئے اور اپنے کام میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ تانا دی سلاطین کو مسلمان کر کے منم خانہ سے کعبہ کے لیے پاسان مہیا کر دیئے۔

ہندوستان میں اکبر کے دور میں ساری سلطنت کا رخ الحاد و لادینیت کی طرف ہو گیا۔ ہندوستان کا عظیم ترین بادشاہ ایک وسیع و طاقتور سلطنت کے پورے وسائل و ذخائر کے ساتھ اسلام کا امتیازی رنگ مٹانا چاہتا تھا۔ اس کو اپنے وقت کے لائق ترین و ذکی ترین افراد اس مقصد کی تکمیل کے لیے ماحصل تھے۔ سلطنت میں ضعف و پھیلاؤ سالی کے کوئی آثار ظاہر نہ تھے کہ کسی فوجی انقلاب کی امید کی جاسکے۔ علم و ظاہری قیاسات کسی خوشگوار تبدیلی کے امکان کی تائید نہیں کرتے تھے۔ اس وقت ایک درویش بے نوائے تن تھا اس انقلاب کا بیڑہ اٹھایا۔ اور اپنے یقین و ایمان، عزم و توکل اور روحانیت و لہیت سے سلطنت کے اندر ایک ایسا اندرونی انقلاب شروع کیا کہ سلطنت مغلیہ کا ہر جانشین اپنے پیٹرو سے بہتر ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اکبر کے تخت سلطنت پر بالآخر محمد الدین اورنگ زیب نظر آیا۔ اس انقلاب کے بانی امام ظریقیت حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی تھے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر فرنگی "تانا دیوں" یا مجاہدین صلیب

کی یورش ہوئی تو ان کے مقابلہ میں عالم اسلام کے ہر گوشہ میں جو مردان کلاہ سر سے کفن باندھ کر میدان میں آئے۔ وہ اکثر و بیشتر شیوخ طریقت اور اصحاب سلسلہ بزرگ تھے، جن کے تزکیہ نفس اور سلوک راہ نبوت نے ان میں دین کی قیمت کفر کی نفرت، دنیا کی حقارت اور شہادت کی موت کی قیمت دو مہروں سے پیدا کر دی تھی۔ الجزائر (مغرب) میں امیر عبدالقادر نے فرانسیسیوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور ۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۶ء تک نہ خود چین سے بیٹھے، نہ فرانسیسیوں کو چین سے بیٹھنے دیے۔ مغربی توحش نے ان کی شجاعت عدل و انصاف، نرمی و مہربانی اور علمی قابلیت کی تعریف کی ہے۔

یہ مجاہد، ذوقاً و عملاً صوفی اور شیخ طریقت تھا، امیر شکیب ارسلان نے ان الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے :-

”امیر عبدالقادر مرحوم پورے عالم وادیب، عالی  
دماغ اور بلند پایہ صوفی تھے، صرف نظری طور پر  
نہیں بلکہ عملاً اور ذوقاً بھی صوفی تھے، تعریفیں  
ان کی ایک کتاب (المواقف) ہے۔ وہ  
اس سلسلے کے یکتائے روزگار لوگوں میں  
سے تھے اور ممکن ہے کہ متاخرین میں  
ان کی نظیر دستیاب نہ ہو سکے“

وكان المرحوم الامير عبدالقادر  
متملئاً من العلم والكدب سامي  
الذوق، راسخ القدم في التصوف لا يكتفي  
به نظر احمق يمارسه عملاً، ولا يرجح  
اليه شوقاً حتى يعرفه ذوقاً وله في التصوف  
كتاب سماه (المواقف) وهو في هذا المشرب  
من الافراد، فذاذ ربما لا يوجد نظيره  
في المتأخرين له

دشمن کے زمانہ قیام کے معمولات و اوقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

”معدانہ فجر کو اٹھتے صبح کا نماز اپنے گھر کے قریب  
 کان کل یوم یقوم الفجر ویصلی  
 کئی مسجد میں جو محلہ العمارہ میں واقع ہے، پڑھتے،  
 الصبح فی مسجد قریب من دارہ  
 سوائے بیمازی کی حالت کے کسی اس میں نافذ  
 فی محلۃ العمارۃ لایتخلف عن  
 ہوتا، تہجد کے عادی تھے اور رمضان المبارک  
 ذلک الامر من وکان یتہجد اللیل  
 میں حضرات عرفہ کے طریقہ پر ریاضت کرتے،  
 ویعادس فی رمضان الریاضۃ علی  
 برابر سلوک و تقویٰ اور اخلاق فاضلانہ پر قائم  
 طریقۃ الصوفیہ و عازال مثلاً للبر وال تقویٰ  
 رہتے ہوئے ۱۰۵۰ھ میں انتقال کیا۔“  
 دلائل اخلاق الفاضلۃ الی اللہ تعالیٰ بحمدہ اللہ رب العالمین

۱۸۱۳ء میں طاغستان پر جب روسیوں کا تسلط ہوا تو ان کا مقابلہ کرنے والے  
 نقشبندی شیوخ تھے جنہوں نے علم جہاد بلند کیا اور اس کا مطالبہ اور جدوجہد  
 کی کہ معاملات و مقدمات شریعت کے مطابق فیصل ہوں اور قوم کی جاہلی عادات  
 کو ترک کر دیا جائے، امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں :-  
 دتولی کبر الثورہ علماء و اس جہاد کے علمبردار طاغستان کے

۱۲۲ -

۱۲۲ - طاغستان بحر خزر کے مغربی ساحل پر اسلامی آبادی کا ایک ملک ہے۔ اگر شمالی تفتاز کو  
 اس کے ساتھ شامل کر دیا جائے تو ۲۰،۰۰۰ لاکھ کے درمیان مسلمان آبادی ہوگی مشرق میں ہشام بن  
 عبداللہ کے زمانہ میں مسلمانوں نے اس کو فتح کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ ملک ایران کے زیر اثر تھا۔

کے علماء اور طریقہ نقشبندیہ کے  
 (جو طاعتان میں پھیلا ہوئے) شیوخ  
 تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے  
 اس حقیقت کو عام مسلمانوں سے پہلے  
 سمجھ لیا تھا کہ اصل نقصان احکام سے  
 پہنچتا ہے جو خطابات، عمدہ و اقتدار  
 جمہورٹی قیادت و سرداری، عیش و لذت  
 اور تمغوں اور مرتبوں کی لالچ میں قوم فروشی  
 کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یہ سمجھ کر انہوں  
 نے ملکی احکام اور ان کے حامی و دوستوں  
 کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور  
 اس کا مطالبہ کیا کہ معاملات کا  
 فیصلہ شریعتِ مطہرہ کے مطابق ہو۔  
 کہ قوم کی قدیم جاہلی عادات کے۔  
 اس تحریک کے قائد غازی محمد تھے،  
 جن کو روکی قاضی ملا کے لقب سے  
 یاد کرتے ہیں۔ وہ علوم عربیت میں  
 بلند پایہ رہتے تھے۔ ان جاہلی عادات  
 کے ترک کرنے کے بارہ میں ان کی ایک

شیوخ الطريقة النقشبندیہ  
 المنتشر قد هناك وكانهم  
 سبقوا سائر المسلمين الى  
 معرفة كود ضررهم هو من  
 اس اثمهم الذميت اكثرهم  
 يليغون حقوق الامة بقلب ملك  
 او امير وتيقو كرسى و سرير و رفع علم  
 كاذب ولذخه فارعة با مطاء اوسمة  
 و صراة فتادوا منذ ذلك الوقت  
 على الامراء وعلى الروسية عاميتهم  
 وطلبوا ان تكون المعاملات وفقا  
 لاصول الشريعة لالعادات القديمة  
 الباقية من جاهلية  
 اولئك الاقوام وكان زعيم  
 تلك الحركة غازي محمد  
 الذي يلقبه الروس بقاضي  
 ملاء، وكان من العلماء  
 المتبحرين في العلوم  
 العربية وله تاليف في



فی وجوب نبد تملك تصنیف "اقامة البرهان علی  
 العادات المقدیمة المخالفة ارتداد عرفاء طاغستان"  
 للشراء اسمه اقامة البرهان (طاغستان کے چودھریوں اور برادری  
 علی ارتداد عرفاء کے سرداروں کے ارتداد کا ثبوت)  
 طاغستان " ہے "

۱۸۳۲ء میں غازی محمد شہید ہوئے اُن کے جانشین حمزہ بے ہوئے۔  
 ان کے بعد شیخ شامل نے مجاہدین کی قیادت سنبھالی جو بقول امیر شکیب،  
 "امیر عبدالقادر الجزائر می رحمة اللہ علیہ کے طرز پر تھے اور مشیخت سے  
 امارت ہاتھ میں لی تھی"

شیخ شامل نے ۲۵ برس تک دُوس سے مقابلہ جاری رکھا اور مختلف  
 معرکوں میں اُن پر زبردست فتح حاصل کی۔ دُوس اُن کی شوکت اور شجاعت  
 سے مرعوب تھے۔ اور چند مقامات کو چھوڑ کر سارے ملک سے بے دخل ہو گئے  
 تھے۔ ۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۴ء میں شیخ نے اُن کے سارے قلعے فتح کر لیے اور  
 بڑا جنگی سامان مالِ غنیمت میں حاصل کیا۔ اس وقت حکومت دُوس نے  
 اپنی پوری توجہ ہماغستان کی طرف مبذول کی۔ طاغستان میں جنگ کرنے کے  
 لیے باقاعدہ دعوت دی، شعراء نے نظلیں لکھیں اور پئے در پئے فوجیں روانہ  
 کی گئیں۔ شیخ شامل نے اس کے باوجود بھی مزید دس برس تک جنگ جاری رکھی  
 بالآخر ۱۸۵۹ء میں اس مجاہدِ عظیم نے ہمتیار ڈالے۔

تقویٰ و جہاد کی جامعیت کی درخشاں مثال سیدی احمد الشریف السنوسی کی

ہے۔ اطالویوں نے برقہ و طرابلس کی فتح کے لیے پندرہ دن کا اندازہ لگایا تھا، تو آبادیوں اور بادلوں کی جنگ کا تجربہ رکھنے والے انگریز قائدین نے اس پر تنقید کی اور کہا کہ یہ اطالویوں کی نا تجربہ کاری ہے۔ اس مہم میں ممکن ہے تین مہینے لگ جائیں۔ لیکن پندرہ دن، نہ تین مہینے، اس جنگ میں پورے تیرہ برس لگ گئے اور اطالوی پھر بھی اس علاقہ کو مکمل طریقہ پر سر نہ کر سکے۔ یہ سنوسی درویشوں اور ان کے شیخ طریقت سیدی احمد الشریف کی مجاہدانہ جدوجہد تھی جس نے اطالیہ کو پندرہ سال تک اس علاقے میں قدم جما نے نہیں دیئے۔

امیر شکیب نے لکھا ہے کہ سنوسیوں کے کارنامے نے ثابت کر دیا کہ طریقہ سنوسیہ ایک پوری حکومت کا نام ہے، بلکہ بہت سی حکومتیں بھی ان جنگی وسائل کی مالک نہیں ہیں، جو سنوسی رکھتے ہیں۔ خود سیدی احمد الشریف کے متعلق ان کے الفاظ ہیں :-

وقد لخطت منه مبرا قتل	مجھے سید سنوسی میں غیر معمولی مہم اور
ان يوجد في غيابة من	ثابت قدمی دکھائی دی جو کم لوگوں
الرجال وعز ما شديد اتلو	میں دیکھی گئی ہے، اور نوالعزمی ان کے
سيماؤة على وجهه فينا	نامیہ اقبال سے ہو یا ہے۔ ایک طرف
هونف تقواة من الابدال	اپنے تقویٰ و عبادت کے لحاظ سے اگر وہ
اذا هونف شجاعته من	اپنے زمانہ کے اہل میں شمار ہونے کے
الابطال -	قابل ہیں تو دوسری طرف شجاعت کے لحاظ سے

دیران زمانہ کی صف میں شامل ہونے  
کے مستحق ہیں۔

امیر شکیب نے صحرا، اعظم افریقہ کی سنوسی خانقاہ کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ بڑی دل آویز اور سبق آموز ہے۔ یہ خانقاہ واحۃ الکفرہ میں واقع تھی اور سیدی احمد الشریف کے چچا اور شیخ السید المہدی کے انتظام میں تھی۔ اور اندریقہ کا سب سے بڑا روحانی مرکز اور جہاد کا دارالترہیت تھی۔ امیر مرحوم لکھتے ہیں :-

سید مہدی مہابہ و تابصین کے نقش قدم پر تھے، وہ عبادت کے ساتھ بڑے عملی آدمی تھے، ان کو معلوم تھا کہ قرآنی احکام حکومت و اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے وہ اپنے برادران طریقت اور مریدین کو ہمیشہ شہساری، نشانہ بازی کی مشق کی تاکید کرتے رہتے۔ ان میں غیرت اور مستعدی کی رُوح چھونکتی، ان کو گھوڑ دوڑ اور سپہ سالاری کا شوق دلاتے رہتے اور جہاد کی فضیلت و اہمیت کا نقش ان کے دل پر قائم کرتے۔ ان کی یہ کوششیں باہر اور ہومیں اور مختلف مواقع پر اُس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ خصوصاً جنگ طرابلس میں سنوسیوں نے ثابت کر دیا کہ ان کے پاس ایسی مادی قوت ہے جو بڑی بڑی حکومتوں کی طاقت سے ٹکر لے سکتی ہے اور بڑی باجبروت سلطنتوں کا مقابلہ کر سکتی ہے، صرف جنگ طرابلس

ہی میں سنوسیوں کا جوش و غضب ظاہر نہیں ہوا بلکہ علاقہ کا نام اور واڈی سوڈان میں وہ ۱۳۱۹ء سے ۱۳۳۲ء تک فرانسیسیوں سے برسرِ جنگ رہے ہیں۔

سید احمد الشریع نے مجھے سنایا کہ اُن کے چچا سید مہدی کے پاس پچاس پچاس ذاتی بندوقین تھیں، جن کو وہ بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے ہاتھ سے صاف کرتے اور پونچھتے تھے، اگرچہ اُن کے سینکڑوں کی تعداد میں مریدین تھے، مگر وہ اس کے روادار نہ تھے کہ یہ کام کوئی اور کرے تاکہ لوگ ان کی اقتداء کریں اور جہاد کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کے سامان و ذخائر کا اہتمام کریں، جمعہ کا دن جنگی مشقوں کے لیے مخصوص تھا۔ گھوڑوں کی ریس ہوتی، نشانہ بازی کی مشق ہوتی وغیرہ وغیرہ۔

نور سید ایک بلند جگہ پر تشریف فرما ہوتے۔ شہسوار دو سوں (پاڑیوں) میں تقسیم ہو جاتے اور دو شروع ہوتی۔ یہ سلسلہ دن پچیس تک جاری رہتا۔ کبھی کبھی نشانہ مقرر ہوتا اور نشانہ بازی شروع ہوتی۔ اس وقت علماء و مریدین کا نمبر شہسواری و نشانہ بازی میں بڑھا ہی ہوا ہوتا، کیونکہ اُن کے شیخ کی اُن کے لیے خاص تاکید تھی۔ جو لوگ گھوڑوڑ میں پالاجیت لیتے یا نشانہ بازی میں بازی لے جاتے، اُن کو قیمتی انعامات ملتے، تاکہ جنگی کمالات کا انہیں شوق ہو۔

جمرات کا دن دستکاری اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کے لیے

مقرر تھا، اُس دن اسباق بند ہو جاتے۔ مختلف پیشوں اور صنعتوں میں لوگ مشغول ہوتے، کہیں تعمیر کا کام ہو رہا ہوتا، کہیں نجاری، کہیں لوہاری، کہیں پارچہ بانی، کہیں دراقی کا مشغلہ نظر آتا۔ اس دن جو شخص نظر آتا وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتا دکھائی دیتا۔ خود سید ہمدی بھی پورے مشغول رہتے تاکہ لوگوں کو عمل کا شوق ہو۔

سید ہمدی اور ان سے پہلے اُن کے والد ماجد کو زراعت اور درخت لگانے کا بڑا اہتمام تھا۔ اس کا ثبوت اُن کی خانقاہ میں اور ان کے خاویہ باغ ہیں، کوئی سنوسی خانقاہ ایسی نہیں ملے گی جس کے ساتھ ایک یا چند باغات نہ ہوں۔ وہ نئے نئے قسم کے درخت دور دراز مقامات سے اپنے شہروں میں سجاتے تھے۔ انہوں نے کفرہ اور جنوب میں ایسی زراعتیں اور درخت روشنائیں کیں جن کو وہاں کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔

بعض طلباء سید محمد سنوسی (بانی سلسلہ سنوسیہ) سے کیا سکھانے کی درخواست کرتے تھے تو وہ فرماتے تھے کہ ”کیماہل کے نیچے ہے“ اور کبھی فرماتے ”کیما کیا ہے ہاتھ کی محنت اور پیشانی کا پسینہ ہے“ وہ طلباء اور مریدین کو پیشوں اور صنعتوں کا شوق دلاتے اور ایسے جملے فرماتے جن سے اُن کی ہمت افزائی ہوتی اور وہ اپنے پیشوں اور صنعتوں کو حقیر نہ سمجھتے اور نہ ان میں علماء کے مقابلے میں احساسِ کمتری پیدا ہوتا۔ چنانچہ فرماتے تھے ”بس تم کو

حسن نیت اور فرائض کی پابندی کافی ہے، دوسرے تم سے افضل نہیں، کبھی کبھی اپنے کو بھی پیشہ وروں میں شامل کر کے اور ان کے ساتھ کام میں شرکت کرتے ہوئے فرماتے :-

”کیا یہ کاغذوں والے (علماء) اور تیبیوں والے (صوفیہ و ذاکرین) سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے یہاں سبقت لے جائیں گے۔ نہیں خدا کی قسم! وہ ہم سے کبھی سبقت نہیں لے جاسکتے۔“

عالم اسلامی پر سید جمال الدین افغانی مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت و دعوت نے جو اثر ڈالا ہے وہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ نئے دُنیا نے اسلام کے محاروں میں ہیں۔ سید جمال الدین افغانی مرتا پاد دعوت و عمل اور ایک شعلہ جوالا تھے، جس نے افغانستان سے لیکر ترکی تک تمام عالم اسلام میں نیت اسلامی کی دُور اور اتحاد اسلامی کا مورچہ چوکا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے سوز و دروں اور گرمی نفس میں اور ان کی بے چین طبیعت اور مسلسل جدوجہد میں ذکر قلبی اور باطنی بیداری کو بھی دخل ہے۔ جس کے بغیر اکثر آدمی مسلسل محنت اور مخالفتوں اور مایوس کن حالات کا ہمیشہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہی حال ان کے شاگرد رشید اور دست راست شیخ محمد عبدہ کا ہے جو تصوف کے لذت آشنا اور اس

www.KitaboSunnat.com

گوچہ سے واقف تھے یہ

مقام دینی تحریکوں میں الاخوان المسلمون کی تحریک سب سے زیادہ طاقتور اور منظم تحریک ہے اور عالم عربی کے لیے تو وہ اچانے دین اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی واحد تحریک ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی زندگی سے پورا رابطہ ہے اور ممالک عربیہ کی عمومی زندگی پر اس نے بڑا گہرا اور محسوس اثر ڈالا ہے، اس کے بانی شیخ حسن البنا مرحوم کی شخصیت بڑی موثر، دل آویز اور ہمہ گیر شخصیت تھی، وہ سرتاپا عمل اور محنتم جہد و جہد تھے۔ نہ تنہا نکلنے والے، نہ مایوس ہونے والے نہ پست ہونے والے سپاہی اور داعی تھے۔ ان کی ان خصوصیات میں ان کے روحانی نشوونما اور سلوک کو بڑا دخل ہے۔ وہ جیسا کہ انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح میں تصریح کی ہے۔ طریقہ صحافیہ بناؤ لیں بیعت تھے اور باقاعدہ اس کے اذکار و اشغال کی ورزش کی تھی۔

ان کے خواص اور محمدین نے بیان کیا کہ وہ زندگی کے آخری مصروف ترین دنوں میں بھی اپنے اوراد و معمولات کے پابند رہے۔ اخوان کی پانچویں مئی ۱۹۵۴ء میں انہوں نے اخوان کی تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی تعریف میں حسب ذیل جملے کہے تھے :-

لے مجھ سے قاہرہ میں مہر کے مشور فاضل و معتمد ڈاکٹر احمد ابن بے نے (جن کو شیخ محمد عبدہ سے شخصی واقفیت اور اسباق میں شرکت کا شرف حاصل ہے) سید جمال الدین اور شیخ محمد عبدہ کی اس مناسبت اور اشغال کا ذکر کیا۔

دعوة سلفية و طريقتہ	ایک ایسی جماعت جس میں
سنیة و حقیقہ ہونیتہ	سلف کی دعوت اہل سنت
و حیثیة سیاسیة و ناعیة	کا طریقہ، تقویٰ کی حقیقت،
دیانیة و رابطہ علمیة	سیاست، ورزش، علم و ثقافت
ثقافیة و شریکة اقتصادیہ	اقتصادی تعاون اور اجتماعی
و فکرہ اجتماعیہ لہ	فکر جمع ہیں۔

ہندوستان میں نعت و جہاد کا ایسا عجیب امتزاج و اجتماع ملتا ہے جس کی نظیر دُور دُور ملنی مشکل ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت سید احمد شہیدؒ کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے کہ ان کی یہ جامعیت مسلمات میں سے ہے اور حدیث تو اتر کو پہنچ چکی ہے۔ ان کے نفاذ کے جہاد اور ان کے تربیت یافتہ اشخاص کے جوش جہاد، شوق شہادت، محبتِ دینی، بغضِ فی اللہ کے واقعات قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

جب کبھی ان کے مفصل واقعات سامنے آئیں گے تو اندازہ ہو گا کہ یہ قرونِ اولیٰ کا ایک بچا ہوا ایمانی جھونکا تھا جو تیرھویں صدی میں چلا تھا اور جس نے دکھا دیا تھا کہ ایمان، توحید اور صحیح تعلق باللہ اور راہِ نبوت کی تربیت و سلوک میں کتنی قوت اور کسی تاثیر ہے اور بغیر میمِ روحانیت اور اصلاح کے پختہ جوش و جذبہ اور ایثار و قربان رجاں سپاری

۱۸ ۱۹

۱۸ ۱۹



کی اُمید غلط ہے۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جانشینوں میں مولانا سید نصیر الدین اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی، سید صاحب کے پوتے تھے۔ ان کے جانشینوں میں مولانا یحییٰ علی اور مولانا احمد اللہ صادق پوری بھی دونوں جانشینوں کے جامع تھے۔ ایک طرف ان کے جہاد و ابتلاء اور امتحان کے واقعات امام احمد بن حنبل کی یاد کو تازہ کرتے ہیں اور وہ کبھی گھوڑے کی پیٹھ پر، کبھی اناج کے پھانسی گھر میں اور کبھی جزیرہ انڈمان میں مجبوس نظر آتے ہیں۔ دوسرے وقت وہ سلسلہ مجددیہ و سلسلہ محمدیہ (سید صاحب کے خصوصی سلسلہ) میں لوگوں کی تربیت و تعلیم میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔

۵ در کئے جام شریعت در کئے سندان عشق

ہر ہو سا کے نداند جام و سندان باختر

ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ کی مجاہدانہ جدوجہد اور قربانیاں اگر ایک پلڑے میں لائی، ایں اور اہل صادق پوری کی جدوجہد اور قربانیاں دوسرے پلڑے پر تو شاید یہی پلڑا بھاری ہے۔

ان حضرات کے بعد بھی ہم کو اہل سلسلہ اور اصحاب ارشاد دینی جدوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ کے کام سے فارغ اور گوشہ نشین نظر نہیں آتے۔ شاملی کے میدان میں حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت حافظ منان، مولانا محمد قاسم نانائوی، مولانا رشید احمد گنگوہی (رحمۃ اللہ علیہم) انگریزوں کے خلاف صفت امدار نظر آتے ہیں۔ حضرت حافظ منان

وہیں شہید ہوتے ہیں۔ حضرت حاجی صاحب کو ہندوستان سے ہجرت کر جانی پڑتی ہے، مولانا نانو توئی و مولانا گنگوہی کو عمرہ تک گوشہ نشین اور ستورہ بنا پڑتا ہے۔

پھر مولانا محمود حسن دیوبندی رحمت اللہ علیہ (جن کو ہندوستان کے مسلمانوں نے بجا طور پر شیخ الحدیث کے لقب سے یاد کیا) انگریزوں کے خلاف جہاد کی تیاری کرتے ہیں اور ہندوستان کو ان کے وجود سے پاک کر کے ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں مسلمانوں کا اقتدار اعلیٰ اور ان کے ہاتھ میں ملک کی زمام کا رہے۔ ان کی بلند ہمتی ان کو ترکی سے تعلقات قائم کرتے اور ہندوستان و افغانستان و ترکی کو ایک سلسلہ جہاد میں منسلک کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ لہٰذا شیخ خطوط، النور پاشا کی ملاقات، مالٹا کی اسارت، ان کی عملی ہمتی اور قوت عمل کا ثبوت ہے۔

من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه

فمنهم من قضي لهنجه ومنهم من ينتظر وما

بدلوا تبديلا۔

ان مسلسل تاریخی شہادتوں کی موجودگی میں یہ کہنا کہاں تک صحیح ہو گا کہ تعطل و بے عملی حالات کے مقابلے میں پھر اندازی اور سپائی تصوف کے لوازم میں سے ہے۔ اگر اس دعوے کے ثبوت میں چند متصوفین اور اصحاب طریقت کی مثالیں ہیں تو اس کے خلاف بڑی تعداد میں ان ائمہ فن اور شیوخ طریقت کی مثالیں ہیں جو اپنے مقدم اور رسوخ فی الطریقہ میں بھی اول الذکر اصحاب

سے بڑھے ہوئے ہیں۔

اگر تقویٰ اپنی صحیح روح اور سلوک راہِ نبوت کے مطابق ہو اور یقین اور محبت پیدا ہونے کا باعث ہو، تو اس کے اہم ترین مقاصد و نتائج ہیں، تو اس سے قوتِ عمل، جذبہ جہاد، عالی ہمتی، جفاکشی، شوقِ شہادت پیدا ہونا لازمی ہے۔ جب محبتِ الہی کا چشمہ دل سے اُبلے گا تو روئیں زمین سے یہ صدا بلند ہوگی ۵

اے آنکھ زنی دم از محبت  
از ہستی خویشین پر ہسینز  
برخیزد بہ تیغ تیز نبشیں  
یا از رہ راه دوست برخیز



## تصوّف و احسان کے طالبوں کو چند ابتدائی مشورے

”اس کتاب کے ابتدائی پانچ مقالات جب باقسط ”الفرقان“ میں شائع ہوئے تو بعض حضرات نے ان کو پڑھ کر اصرار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے جن بندوں کے دلوں میں ان کے مطالعہ سے دین کے اس شعبہ کی ضرورت کا احساس اور اس کی تحصیل کی چاہت پیدا ہو، ان کو کچھ ایسے ابتدائی مشورے دینا بھی ضروری ہیں جن کی روشنی اور رہنمائی میں وہ اگر چاہیں تو بلا تاخیر اپنا سفر شروع کر سکیں۔ کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ اس قسم کے احساسات پر اگر جلدی مہلی قدم نہ اٹھایا جائے تو بالآخر وہ مضر چل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے چند ابتدائی مشورے عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں

کو ان سے فائدہ پہنچائے۔“

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

اللہ کے جن بندوں کے دل میں دین کے اس تکمیلی شعبہ کی طلب اور اس کی تحصیل کا داعیہ پیدا ہو، اُن کو چاہیے کہ :-

سب سے پہلے تو اپنی نیت صحیح کریں۔ یعنی اپنے نفس کی اصلاح اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی عہدیت کے تعلق کی درستی اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی کو مقصود بنائیں۔ کشف و کرامات کی طلب یا بزرگی اور بڑائی حاصل کرنے کی ہوس ایک طرح کا شرک ہے۔ اس لیے اس طرح کا کوئی مقصد دل کے کسی گوشے میں بھی باقی نہ رہنے دیں۔

پھر نیت اور ارادہ کی اس تصحیح کے بعد اس راستہ کی راہنمائی اور رہبری کے لیے اللہ کے کسی ایسے صالح اور صاحب ارشاد بندے کی طرف رجوع کریں جو اس کے اہل ہوں اور طبیعت کو بھی جن کے ساتھ مناسبت ہو اور جن کی خدمت میں پہنچنا اور محبت سے فیضیاب ہونا زیادہ مشکل نہ ہو۔

اگر ایسے حضرات سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے خود فیصلہ اور انتخاب مشکل ہو تو ہمت یہ ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ اور دین میں بصیرت رکھنے والے نیک صالح لوگوں سے مشورہ لیں اور اپنے زمانہ کے جن جن بزرگوں کے متعلق وہ رائے دیں اُن کی خدمت میں جاتیں اور چند چند دنوں ٹھہر کر خود دیکھیں اور جہاں طبیعت کی مناسبت محسوس ہو اور دل میں جن کی عظمت اور محبت زیادہ

پیدا ہو اور جن سے اپنے کو نفع کی زیادہ اُمید ہو، اُن ہی کو اپنے لیے انتخاب کر لیں اور اگر غلص اور اہل مشیروں کے مشورے ہی سے کسی بزرگ کی طرف رجوع کرنے کے لیے اپنی رائے قائم ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اُن ہی کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کر لیا جائے۔ لیکن آخری فیصلہ کرنے اور اپنی طلب اور ارادت کا اُن سے اظہار کرنے سے پہلے بطریق مسنون استخارہ بہر حال کر لیا جائے جس کا طریقہ حدیث میں یہ بتلایا گیا ہے کہ :-

” پہلے اہتمام سے وضو کیا جائے، اس کے بعد دو رکعت نفل نماز پڑھی جائے اور سلام کے بعد دل کی پوری توجہ کیساتھ اللہ تعالیٰ سے اس طرح دُعا کی جائے :-“

اللھم انی استخیرک	” اے اللہ! میں تیرے علم محیط سے اپنی بہتری
بعلمک واستقدرک	چاہتا ہوں (تو ہی اپنے محیط علم سے بہتری کیلئے)
بقدرتک واسالک من	میری رہنمائی فرما، اور تیری قدرتِ کاملہ سے اپنی
فضلک العظیم فانک	بہتری پر قدرت مانگتا ہوں اور تیرے فضلِ عظیم
تقدر ولا اقدر وتعلم	سے سوال کرتا ہوں، کیونکہ تو قادر ہے اور میں عاجز

لہ دُعا نے استخارہ کے یہ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں، اس کے راوی حضرت جابر فرماتے ہیں کہ ” حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو استخارہ کی یہ دُعا ایسے اہتمام سے سکھاتے تھے جیسے اہتمام سے قرآن مجید کی سورتیں سکھاتے تھے “

(مشکوٰۃ بحوالہ بخاری شریف)

ہوں اور تو سب کچھ جانتا ہے اور میں کچھ نہیں جانتا اور تو سب فیوں کا بھی جانتے والا ہے اسے اللہ! اگر یہ کام (جسے بارے میں میں استخارہ کر رہا ہوں) تیرے علم میں میرے لیے میرے دین اور میری دنیا اور میری آخرت کے لیے بہتر ہے اور اس میں میرے لیے خیر ہے تو اسکو میرے واسطے مقدر فرمادے اور اس کا حال کرنا میرے لیے آسان کر دے پھر اسکو باعثِ خیر و برکت بھی بنا دے اور اگر تیرے علم میں اس کام کا انجام میرے لیے، میرے دین، میری دنیا اور میری آخرت کے لیے بُرا ہے تو اسکو میری طرف سے پھیر دے اور میرے دل کو اسکی طرف سے پھیر دے اور جہاں کہیں میرے لیے بہتری ہو اس کو میرے واسطے مقدر کر دے۔ پھر میرے دل کو اس پر راضی اور مطمئن بھی کر دے۔“

وَمَا عَلَّمْنَاكَ  
الْغَيْبَ ۗ اللَّهُمَّ إِن  
كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هَذَا  
الْأَمْرَ خَيْرٌ لِي فِي دِينِي  
وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ  
أَمْرِي فَأَقْدِرْهُ لِي  
وَلَيْسْهُ لِي ثُمَّ بَدِّلْهُ  
لِي فِيهِ وَإِن كُنْتَ  
تَعْلَمُ أَنَّ هَذَا الْأَمْرَ  
شَرٌّ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي  
وَعَاقِبَةِ أَمْرِي فَاصْرِفْهُ  
عَنِّي وَأَصْرِفْنِي عَنْهُ  
وَاقْدِرْ لِي الْخَيْرَ  
حَيْثُ كَانَ ثُمَّ  
ارْحَمْنِي بِهِ -

لے یہاں اس کام اور اس مقصد کا تصور کرنا چاہیے جس کے بارے میں استخارہ کرنا ہو مثلاً اسی شیخ کی طرف رجوع کرنے کے سلسلے میں استخارہ کرنا ہو تو اسی مقصد کا دل میں تصور کیا جائے۔

استخارہ کے بعد اگر دل کا وہ رجحان ویسا ہی رہے یا اور ترقی کر جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر اور برکت کی امید کرتے ہوئے بنام خدا ان ہی بزرگ کی طرف رجوع کرنے اور ان سے اصلاحی تعلق قائم کرنے کا فیصلہ کر لیں۔ اور اگر استخارہ کے بعد دل ادھر سے ہٹ جائے تو پھر کسی اور کے متعلق سوچیں۔

بہر حال استخارہ کے بعد دل کا جو رجحان ہو (خواہ کسی خواب وغیرہ کی رہنمائی سے ہو یا آپ سے آپ ہو) ای کو استخارہ کا نتیجہ سمجھ کر اس کے مطابق عمل درآمد کرنا چاہیے۔

اور اگر ایک دفعہ کے استخارہ کے بعد کوئی رجحان نہ پیدا ہو تو چند بار اسی طرح استخارہ کرنا چاہیے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی رجحان ضرور پیدا ہو جائے گا اور طبیعت اس طرف مائل کر دی جائے گی جس میں بہتری ہوگی۔

بہر حال استخارہ کے بعد جب دل کا رجحان کسی بزرگ کی طرف ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے خیر اور سعادت کی دعا کرتے ہوئے اپنا مقصد ان سے عرض کریں اور اپنی رہنمائی میں لینے کی ان سے درخواست کریں۔ بیعت کا مقصد اور ارادت کی اصل حقیقت بس یہی ہے۔

۱۷۔ مطلب یہ ہے کہ بیعتِ تربیت جہاں کا یہاں ذکر ہے اسی لیے کی جاتی ہے۔ بیعتِ برکت اور

بیعتِ توبہ کا ذکر یہاں نہیں ہے۔ ۱۷



پھر وہ بزرگ جو کچھ ہدایت اور تعلیم فرمائیں اور جو مشورے دیں ان کی اس سے زیادہ اہتمام سے تعمیل اور پابندی کریں جتنے اہتمام سے جسمانی مرضی اپنے معالج، حکیم یا ڈاکٹر کے طبی مشوروں کی پابندی کرتے ہیں۔ اسی لیے یہ ضروری ہے کہ اس راہ کی رہنمائی کے لیے جن کو انتخاب کیا جائے ان میں پہلے ہی یہ چند چیزیں ضرور دیکھ لی جائیں تاکہ تعلق کی بنیاد پورے اطمینان اور اعتماد پر ہو:-

(الف) وہ دین اور شریعت سے واقف ہوں اور ان کے یہاں شریعت و سنت کے اتباع کا پورا اہتمام ہو۔

(ب) ان کے احوال سے یہ اندازہ ہونا ہو کہ وہ اللہ کے مخلص بندے ہیں اور ان کی طلب اور رغبت کا رخ دنیا اور اس کے جاہ و مال کی طرف نہیں، بلکہ اللہ اور آخرت کی طرف ہے۔

(ج) سلوک میں اتنی بصیرت رکھتے ہوں کہ طالب کے حالات کی رعایت رکھتے ہوئے اس کی رہنمائی اور رہبری کر سکیں۔

(د) ان کے طرز عمل سے اس کا اندازہ ہو کہ طالبوں اور تعلق رکھنے والوں سے وہ شفقت رکھتے ہیں اور خیر خواہی اور نفع رسانی کی فکر اور کوشش کرتے ہیں۔

(ه) دین کے اس شعبہ (سلوک) کی تحصیل انہوں نے کسی شیخ کامل کی رہنمائی اور نگرانی میں کی ہو اور ان کی صحبت اٹھائی ہو اور انہوں نے ان کو اشلو و تربیت کا اہل قرار دیا ہو۔

(و) جو لوگ ان سے تعلق رکھتے ہوں اور دین کے سلسلے میں ان کے

پاس آتے جاتے ہوں، اُن کو دینی نفع ہوتا ہو، اور آخرت کی فکر ان میں بڑھتی ہو۔

اگر ان چیزوں کو دیکھ بھال کر اور اپنے دل کا اطمینان کر کے اللہ کے کسی بندہ کے ساتھ راہ سلوک میں استفادہ کا تعلق قائم کیا جائے گا اور اپنے کو ان کی رہنمائی میں دے دیا جائے گا تو انشاء اللہ تعالیٰ ہرگز محرومی نہ رہے گی۔

اور اگر کسی بندہ خدا کے دل میں دین کے اس شعبہ کی طلب اور اپنے نفس کی اصلاح کا داعیہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے پیدا ہو، لیکن کسی وجہ سے وہ کسی شیخ کا انتخاب اپنے لیے نہ کر سکیں تو اُن کے لیے یہ بہتر دُعا کہ کسی شیخ کی طرف رجوع ہونے تک مندرجہ ذیل طریقہ سے بنام خدا اپنا کام شروع کر دیں۔

پہلے اہتمام سے خوب اچھی طرح وضو کریں، پھر جہاں تک ہو سکے پورے خشوع و خضوع کے ساتھ دو رکعت نفل نماز پڑھیں اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کو موجود اور حاضر ناظر یقین کرتے ہوئے اپنے گناہوں کی اس سے معافی چاہیں اور آئندہ کے لیے گناہوں سے بچنے کا اور شریعت پر چلنے کا دل سے عزم اور عہد کریں اور اس بارہ میں اللہ ہی سے توفیق اور مدد مانگیں۔

اگر کبھی زندگی میں اللہ کے کچھ فرائض یا اُس کے بندوں کے کچھ حقوق اپنے ذمہ نہ گئے ہیں تو اُن کی ادائیگی کی فکر کریں اور اس کا طریقہ معلوم کرنے کے لیے اگر

ضرورت ہو تو کسی متقی عالم دین کی طرف رجوع کریں۔

اللہ تعالیٰ کے فرائض میں نماز کی بے حد اہمیت ہے اور دینی ترقیوں کا سب سے اعلیٰ ذریعہ نماز ہی ہے اس لیے اس کو بہتر سے بہتر طریقہ پر اور خضوع و خشوع کے ساتھ پڑھنے کی پوری کوشش کریں اور اس کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھیں یہ

فرض نمازوں اور ٹوکرہ سنتوں کے علاوہ نوافل کی بھی عادت رکھیں خصوصاً تہجد کی پابندی کی کوشش کریں۔ اگر اخیر شب میں اُٹھنے کی عادت نہ ہو تو عادت پڑھانے تک عشاء کی نماز کے بعد ہی وتر سے پہلے آٹھ رکعت نفل (دو دو رکعت کر کے) بہ نیت تہجد پڑھ لیا کریں۔ اگر وقت تنگ ہو تو چھ یا چار یا دو رکعت ہی پڑھ لیں۔

دن رات کے اپنے اوقات میں کوئی وقت اطمینان اور یکسوئی کا خاص ذکر کے لیے مقرر کریں اور اس وقت میں نفی اثبات یعنی لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا ذکر کریں۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے دل و دماغ کو حاضر و یکسو کر کے تہجد ایمان کی نیت سے پورا کلمہ طیبہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ (معنی مطلب کے دھیان کے ساتھ تین دفعہ پڑھیں۔ پھر تین مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ورود شریف پڑھیں، پھر تہجد اور شد کی پوری رعایت رکھتے ہوئے نفی اثبات (لا اله الا الله)

لہ اس عاجز کے رسالہ "نماز کی حقیقت" سے انشاء اللہ اس سلسلہ میں کافی مدد مل سکے گی۔ بہت شکریہ  
بندوں نے بتلایا ہے کہ اس کے مطالعہ سے ان کو بہت فائدہ ہوا۔ ۱۳

گیارہ سو دفعہ پڑھیں اور دل سے ”لا مقصود الا اللہ“ کا دعویٰ کریں۔ اگر یہ ذکر ہلکی آواز کے ساتھ اس طرح کیا جائے کہ لا الہ کتے وقت جسم کو ذرا دھمکی طرف جھکایا جائے اور اللہ کتے وقت بائیں جانب مائل کر قلب پر ہلکی سی ضرب لگائی جائے تو تجربہ ہے کہ اس سے قلب پر اثر زیادہ اور جلدی پڑتا ہے اور اگر ہمت اور وقت میں وسعت ہو تو گیارہ سو نفی اثبات کے علاوہ خواہ اسکے ساتھ ہی، خواہ کسی اور وقت میں تین ہزار یا دو ہی ہزار دفعہ ذکر اسم ذات یعنی اللہ اللہ بھی کیا کریں اور اس میں شد و مد کا لحاظ رکھیں۔

اور بہتر ہے کہ یہ ذکر بھی خفیف جہر سے اس طرح کریں کہ قلب کی بھی اس میں شرکت ہو۔ لے

اس ذکر نفی و اثبات و اسم ذات کے علاوہ ہر نماز کے بعد تسبیحاتِ فاطمہ یعنی ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۳ بار الحمد اکبر کو بھی معمول بنالیں۔

لے یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ذکر میں جہر و صبر وغیرہ ذکر کی تاثیر بڑھانے کی ایک تدبیر ہے۔ اس سے اجر و ثواب میں کوئی زیادتی نہیں ہوتی اور اس کی ضرورت مرنے والوں کو ہوتی ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مشائخ میں جہر و صبر وغیرہ کے مختلف طریقے رائج ہیں اور اپنے اپنے تجربہ کے احوال کے لحاظ سے ذکر کی مقدار بھی مختلف بتائی جاتی ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ ابتداء میں ہر قسم کے طالب کے لیے یہ مناسب رہے گا۔ نیز ذکر کا صحیح طریقہ مل کر زبان ہی سے لکھا جاسکتا ہے۔ اوپر جو طریقہ لکھا گیا ہے وہ بس اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک کہ کسی عامبِ ذکر سے سیکھنے کی نوبت آئے۔ ۱۲

نیز سوتے وقت ہی تسبیحاتِ فاطمہ اور استغفار و درودِ شریف سو سو دفعہ پڑھ لیا کریں۔

اس کے علاوہ چلتے پھرتے اور اٹھتے بیٹھتے ذکرِ یادِ عا کا کوئی کلمہ پڑھنے کی عادت ڈال لیں۔ مثلاً سبحان اللہ و بحمدہ یا لا الہ الا اللہ یا آیت کریمہ لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین یا استغفر اللہ ربی یا حی یا قیوم برصحتک استغیث یا اس قسم کا کوئی کلمہ۔

بہر حال اس کی عادت پڑ جائے کہ اپنے کاموں میں مشغولی کے وقت بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کلمہ زبان پر آتا رہے اور اس کے ذریعہ دل میں اللہ کی یاد اور اس کی طرف توجہ تازہ ہوتی رہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کے لیے بھی کوئی وقت مقرر کر لینا چاہیے۔ اگرچہ وہ وقت تھوڑا ہی ہو اور زیادہ نہ ہو سکے تو ایک دو ہی رکوع کی تلاوت کر لی جائے اور ذکر ہو یا تلاوت زیادہ سے زیادہ توجہ اور دھیان کے ساتھ اور دل کے ذوق شوق کے ساتھ ہو۔ پھر چند منٹ کا کوئی مناسب وقت اس کے لیے بھی مقرر کیا جائے کہ بعد از اس وقت دل و دماغ کو ہر چیز سے خالی اور یکسو کر کے موت اور اس کے بعد جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کا مراقبہ کیا جائے۔ یعنی سوچا جائے کہ ایک دن ضرور ایسا آنے والا ہے کہ میں اس دُنیا سے اٹھایا جاؤں گا۔ پھر نلانی، کھنڈانی اور نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد لوگ مجھے قبر میں دفن کر اٹھیں گے۔ پھر قبر میں اس طرح سوال و جواب ہوگا۔ اس کے بعد سینکڑوں یا ہزاروں برس مجھے تنہا اس قبر میں رہنا ہوگا۔ اس کے بعد ایک وقت قیامت آئیگی پھر حشر نثر ہوگا،

پھر حساب ہو گا اور میرا اعمال نامہ میرے سامنے لایا جائے گا جس میں میرے سارے اعمال درج ہوں گے اور اللہ کے فرشتے گواہی دیں گے اور خود میرے اعضاء ہاتھ پاؤں وغیرہ میرے خلاف گواہ ہوں گے۔ اس وقت اللہ کے سامنے میرا کیا حال ہو گا؟ پھر میرا فیصلہ سنایا جائے گا اور مجھے اس جگہ بھیج دیا جائے گا جس کا میں سزاوار ہوں گا۔

بہر حال آنے والے ان سب واقعات کا تصور اس طرح کیا جائے کہ گویا یہ سب کچھ گزرا رہا ہے اور پھر خوف اور ڈر سے بھرے دل سے اللہ سے استغفار کیا جائے اور گناہوں کی معافی چاہی جائے اور دم اور کرم کی التجا کی جائے۔

ان چند چیزوں کی پابندی کے ساتھ جیسا کہ پہلے بتلایا جا چکا ہے، گناہوں سے بچنے کی پوری کوشش کی جائے اور جب کبھی کوئی گناہ مرتد ہو جائے تو جلدی اس سے توبہ کر لی جائے۔

گناہوں کے سوا دو اور چیزوں میں بھی خاص طور سے احتیاط کی جائے ایک یہ کہ ضرورت سے زیادہ کھانے کی عادت چھوڑی جائے۔ یعنی اتنا کھایا جائے جس سے قوت پوری قائم رہے اور سستی نہ آئے، جو زیادہ پیٹ بھرنے سے آتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ بات صرف ضرورت سے کی جائے۔ یعنی صرف وہ باتیں کی جائیں جو دین یا دنیا کی حیثیت سے ضروری اور مفید ہوں اور ہمیشہ سوچ کر بولنے کی عادت ڈالی جائے۔

اس سلسلہ کی ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اپنے کو دوسروں سے کتر اور

دُومروں کو بہتر اور برتر سمجھنے کی۔ اسی طرح اپنے نفس کے ساتھ بدگمانی کرنے اور دُومروں کے ساتھ نیک گمانی کرنے کی عادت ڈالی جائے۔  
 اور سب سے آخری بات یہ کہ ان تمام چیزوں کے بارہ میں اپنا احتساب اور اپنی نگرانی پورے اہتمام سے کی جائے۔ بل الإنسان علی نفسه بصیرت ولو العف معاذیر۔

ہر طالب کو اپنا کام شروع کرنے کے لیے یہ چند مشورے انشاء اللہ بالکل کافی ہوں گے اور اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ اُس کے لیے رہنمائی و دستگیری حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتی رہے گی۔

والذین جامدوا فینا لنهدیتہم سُبُلنا وان اللہ لیمح المحصنین



## انتباہ

ان مشوروں کے متعلق ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ ان کے بعد کسی صاحبِ ارشاد سے اصلاحی تعلق قائم کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی، بلکہ ان کے لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ جن حضرات میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے دین کے اس تکمیلی شعبہ کی طلب پیدا ہو جائے اور اپنے خاص حالات کی وجہ سے کسی صاحبِ ارشاد سے جلدی وہ استفادہ نہ کر سکیں تو ان مشوروں کے مطابق کام شروع کر دیں اور جب اپنے لیے کسی روحانی مصلح کا انتخاب کر لیں تو اپنے کو اس کی رہنمائی کا پابند کر دیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس راہ میں پوری رہنمائی کسی زندہ ہستی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

منظور نعمانی

الکتب الخیر

جے ماڈل ٹاؤن - لاہور

8-2470



بخاری شریف کی منتخب احادیث کا ترجمہ اور بے مثل تشریح

بِحَبْرَةِ الْقَدْرِ تَرْجُومَةً بِحَبْرَةِ الْبِقَعِ

# انتخاب بخاری شریف

(ترجمہ و تشریح)

تخریج احادیث

امام بخاری قدس اللہ سرہ العزیز ۲۵۶ھ

زیر نگرانی  
حکیم الامت مولانا شرف علی تھانوی  
۱۳۶۲ھ

اردو ترجمہ و تشریحی وفد  
حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی  
۱۳۹۲ھ

عربی شرح  
علامہ ابن ابی جبرہ مالکی اندلسی  
۴۹۹ھ

احادیث شریفہ سے مسائل سلوک و قصوت، مسائل اخلاق و آداب اور مسائل فقہ کے استنباط پر وہ گرانمایہ کتاب جو ہر دور میں علماء صوفیاء اور دیندار حضرات کی توجہ کا مستحقہ طور پر مرکز رہی ہے۔ بخاری شریف کی منتخب احادیث کی بے نظیر تشریح

ادارۃ اسلامیات انارکلی لاہور

# اکابر علماء دیوبند

برصغیر پاک و ہند کے ۶۸ ممتاز اکابر علماء دیوبند  
کے حالات و کمالات اور خدماتِ جلیلہ کا جامع تذکرہ

تالیف

حافظ محمد کبیر شاہ صاحب بخاری

الْإِسْلَامِيَّة

۱۹۰۔ انارکلی لاہور

اپنے لائبریری کے لیے

# پندرہ سو کتابیں

- انتخابِ نجاری (ترجمہ تیسرا) از حضرت مولانا غلام مصطفیٰ صاحب مدظلہ العالی
- اسلامی تمدن و عقائد - از حضرت مولانا قاری محمد طریقت صاحب مدظلہ العالی
- المکاشفہ فی حق غلط تصورات از حضرت مولانا قاری محمد طریقت صاحب مدظلہ العالی
- آفتابِ حقیقت - از حضرت مولانا قاری محمد طریقت صاحب مدظلہ العالی
- آیت کیسے شون برتے جا سکتے ہیں؟ از حضرت مولانا قاری محمد طریقت صاحب مدظلہ العالی
- شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں از حضرت مولانا قاری محمد طریقت صاحب مدظلہ العالی
- اسلام اور ہندومت - از حضرت مولانا غلام مصطفیٰ صاحب مدظلہ العالی
- عقائد اسلام - از مولانا محمد طاہر قاسمی صاحب مدظلہ العالی
- مفتی اعظم پاکستان اکابر معاصرین کی نظروں سے اسلام آباد
- تجلیاتِ مدینہ از حضرت مولانا محمد عتیق صاحب مدظلہ العالی
- مسلمانوں کی عروج و زوال از حضرت مولانا سعید احمد صاحب مدظلہ العالی
- طلب فرمائیے

# ادارہ اسلامیات

۱۹۰ - انارکلی - لاہور

# آپ کی لائبریری کیلئے چھ سو کتابیں

- مکتوباتِ نبویؐ (مجموعہ) از مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ العالی
- حضرت ابو بکر صدیق کے سرکاری خطوط (مجموعہ) از مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ العالی
- حضرت عمر فاروق کے سرکاری خطوط (مجموعہ) از مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ العالی
- حضرت عثمان غنی کے سرکاری خطوط (مجموعہ) از مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ العالی
- شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات (مجموعہ) از مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ العالی
- علم و عمل (مجموعہ) از مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ العالی
- اسلام کا اقتصادی نظام (مجموعہ) از مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ العالی
- حیاتِ شیخ الحدیث از مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ العالی
- بزمِ اشرف کے چراغ (مجموعہ) از مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ العالی
- کیفیتِ اسلام (مجموعہ) از مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ العالی

طلب فرمائیے

# ادارہ اسلامیات

۱۹۰ - انارکلی - لاہور

۱۹۰